داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القُرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

اب دو انداز سے دستیاب ہے

- خوبصورت ٹائٹل
- عمدہ سفید کاغذ
- معیاری طباعت

1 2935 صفحات پر مشتمل، سات جلدوں میں

(الگ الگ جلدیں بھی دستیاب ہیں!)

مکمل سیٹ کی قیمت: 5000 روپے

2 متعدد اضافی خوبیوں کا حامل، طبع جدید

- قرآنی رسم الخط
- تفسیری سائز
- مضبوط ریگزین جلد

2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں

مکمل سیٹ کی قیمت: 4800 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

شعبان المعظم ۱۴۴۳ھ

مارچ ۲۰۲۲ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

روشن خیالی اور اسلام

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 71

شمارہ : 3

شعبان المعظم 1443ھ

مارچ 2022ء

فی شمارہ : 40 روپے

سالانہ زرِتعاون: 400 روپے

مُدیر
حافظ عاکف سعید

مجلس ادارت:
ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون:
حافظ محمد زاہد، محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000 ' ای میل: maktaba@tanzeem.org

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارُالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375(042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال 5

بُت کدۂ ہند میں تکبیرِ ربّ کی گونج — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن 9

سورۃ المُمتحنۃ — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکرہ وتبصرہ 27

روشن خیالی اور اسلام — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ہماری دعوت 47

انفرادی نصب العین اور اجتماعی ہدف — انجینئر عمیر نواز

تعلیم وتعلّم 57

مطالعہ اچھی تحریر کے لیے غذا ہے! — راحیل گوہر

انوارِ ہدایت 66

وقت — متاعِ بے بہا — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

علومِ قرآنی 70

تفسیر کے ناقابلِ اعتبار مآخذ (۴) — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

❁❁❁

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

بُت کدۂ ہند میں تکبیرِ ربّ کی گونج

بعض لوگوں کی رائے ہے کہ میدانِ جنگ میں بہادری اور شجاعت اُس وقت مطلوب اور فیصلہ کن ہوتی تھی جب میدانوں میں تلواریں اور نیزوں سے دوبدو جنگ لڑی جاتی تھی۔ آج کے ایٹمی میزائلوں کے دور میں جب بٹن دبانے سے دشمن کی سرزمین پر تباہی پھیلائی جاسکتی ہے تو جنگجوؤں کی بہادری غیر اہم ہو چکی ہے۔ ہماری رائے میں ایسا میدانِ جنگ جس میں اسلحہ کا استعمال ہو‘ ٹیکنالوجی کی تمام تر ترقی کے باوجود اُس میں افراد کی بہادری اور دلیری کا رول کچھ کم تو ہوسکتا ہے‘ ختم نہیں ہوسکتا‘ جس کی موجودہ دور میں بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ البتہ اخلاقی‘ معاشرتی اور ذہنی سطح پر آج بھی بہادری اور شجاعت کا رول انتہائی اہم اور فیصلہ کن ہے۔ اس حوالے سے بہادری اور دلیری کسی حق اور سچ کی بنیاد پر ہوسکتی ہے۔ کسی اہم میٹنگ میں ۹۹ فیصد لوگ ایک رائے رکھتے ہوں اور آپ اکیلے الگ رائے رکھتے ہوں تو آپ کا مخالفین کی زیادہ تعداد کی رائے کا اثر قبول نہ کرنا اور اپنے برحق موقف پر ڈٹ جانا بھی بہادری ہے۔

اسلامی معاشرے میں بگاڑ کی وجہ سے اگر کسی مجلس میں ایک دو کے سوا تمام خواتین بے پردہ اور کم لباس ہوں تو ان ایک دو خواتین کا مکمل ستر اور حجاب میں رہنا اور ان بے پردہ خواتین کا رتّی بھر اثر قبول نہ کرنا بھی بہادری ہے‘ کیونکہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ انتہائی قلیل تعداد میں یہ مستور خواتین اجنبی بن کر رہ جائیں گی۔ لیکن اگر ملک بھارت جیسا ہو اور حکومت بی جے پی کی ہو‘ جو آر ایس ایس کا سیاسی ونگ ہے اور صورتِ حال یہ ہو کہ مسلمان گائے ذبح کرتے کرتے خود ذبح ہو جائے‘ اور جس ملک میں یہ نعرہ زوردار انداز میں لگ رہا ہو ’’مسلمان کے دو استھان: پاکستان یا قبرستان‘‘ وہاں کی حکومت آر ایس ایس کے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے مسلمان خواتین پر غیر آئینی‘ غیر قانونی پابندی لگا رہی ہو اور آر ایس ایس کے غنڈے کسی کالج کے باہر جمع ہو کر ایک باپردہ مسلمان عورت پر آوازیں کسیں تو اُس اکیلی عورت کا نہ گھبرانا بلکہ

’’جے شری رام‘‘ کے مشرکانہ نعرے کے خلاف ربِّ واحد کی تکبیر کا واشگاف اعلان کرنا اخلاقی اور معاشرتی سطح پر بہادری اور شجاعت کی بلند ترین سطح ہے۔ البتہ ایسی ہمت و جرأت کا اظہار تب ہی ممکن ہے جب انسان کا اپنے نظریے پر ایمان غیر متزلزل ہو بلکہ نظریہ جان سے زیادہ عزیز ہو‘ اور شہادت مطلوب و مقصود ہو اور انسان دُنیوی سود و زیاں سے بے نیاز ہو چکا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کو ہندوتوا کی طرف دھکیلنے والی انتہائی متعصّب مودی حکومت اکیلی خاتون کے ہاتھوں دُنیا بھر میں ایسی رسوا ہوئی کہ اُس کے اتحادی بھی مسلمانوں کے دشمن ہونے کے باوجود اس کا کھل کر ساتھ نہ دے سکے۔ اگرچہ ہم سمجھتے ہیں کہ مغربی ممالک کا اِس موقع پر کھل کر ساتھ نہ دینا درحقیقت اپنی ساکھ کو بچانے اور یہ بھرم قائم کرنے کی کوشش تھی کہ انسانی حقوق‘ خاص طور پر حقوقِ نسواں‘ جہاں کہیں بھی روندے جائیں گے ہم اُس کا نوٹس لیں گے اور اُس پر احتجاج کریں گے۔ یہ پوزیشن صرف اِس لیے لی گئی کیونکہ کسی بڑے ردِّعمل سے اُنہیں بچنا تھا۔

ثبوت کے طور پر ہم بعض مغربی ممالک کا حجاب کے خلاف طرزِ عمل اور وہاں کی گئی قانون سازی قارئین کے سامنے رکھتے ہیں۔ اسلام سے نفرت‘ اسلاموفوبک دہشت گردی کی سرپرستی اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کے اِس رویے اور پالیسی میں فرانس مغرب کو لیڈ کر رہا ہے‘ جہاں ۲۰۱۰ء میں برقعہ پر پابندیاں لگائی گئیں اور عوامی جگہوں پر چہرہ ڈھانپنے پر پابندی ایک انتظامی آرڈر کے ذریعے نافذ کی گئی۔ ۲۰۲۱ء میں حجاب پر پابندی کے خلاف مسلمان خواتین نے آن لائن احتجاج رجسٹرڈ کرایا۔ دسمبر میں فرانسیسی حکومت کا ایک اور مسلم مخالف فیصلہ آ گیا اور مسلم خواتین پر حجاب پہن کر کھیل میں حصہ لینے پر پابندی لگا دی گئی۔ پھر چالاکی کا مظاہرہ یوں کیا گیا کہ پابندی کا جواز ڈسپلن کی خلاف ورزی کو بنایا گیا۔ فرانسیسی سینٹ بھی پیچھے نہ رہا‘ اس نے بھی جوں کی توں اِس پابندی کی منظوری دے دی۔ سپین میں ۲۰۱۰ء میں برقعہ پہننے کی پابندی لگی‘ لیکن عدالت نے ۲۰۱۳ء میں یہ قانون منسوخ کر دیا۔ بلجیم میں ۲۰۱۲ء میں برقعہ پر پابندی کا فرانس کی طرز کا ایک قانون بنایا گیا اور قانون شکنی پر ۳۸۰ یورو جرمانہ اور سات دن کی قید مقرر کی گئی۔ علاوہ ازیں ڈنمارک‘ ناروے اور ہالینڈ میں بھی قانون کے ذریعے پردے پر پابندی لگا دی گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ پردے اور حجاب پر پابندی ایک زبردست حکمتِ عملی کے تحت لگائی

گئی۔ علاوہ ازیں مادر پدر آزادی‘ عریاں لباس‘ بے حیائی اور فحاشی کا پھیلاؤ یہ سب ایک بڑی منصوبہ بندی کا حصّہ ہے۔ حقیقت کچھ یوں ہے کہ صہیونی جب سرمائے اور میڈیا کے ذریعے یورپ کو بالواسطہ طور پر زیرِ تسلّط لے آئے تو اُنھوں نے دنیا پر اپنے ایجنٹوں کے ذریعے غالب آنے کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ ۱۹۰۳ء میں شائع ہونے والے یہودی صہیونی پروٹوکولز اِس خواب کی تعبیر کی طرف ایک تحریری قدم تھا۔ اُس زمانے میں سلطنتِ عثمانیہ اُن کا ہدف تھی‘ لہٰذا مسلمانوں کو خاص طور پر اِس حوالے سے ٹارگٹ کیا گیا تاکہ وہ اِن چیزوں میں ملوث ہو کر اُن کا آسان شکار بن جائیں۔ صہیونیوں نے سمجھا کہ دنیا میں اگر بے حیائی‘ عریانی اور فحاشی عوام میں زیادہ سے زیادہ پھیلائی جائے تو وہ نہ صرف اپنے اِس ایجنڈے کی طرف تیزی سے بڑھ سکیں گے بلکہ بہت سے دوسرے ممالک خود بخود اُن کے معاون اور سہولت کار بن جائیں گے۔ یہاں اس بات کا ضمنی طور پر ذکر آ جائے کہ صہیونیوں نے دنیا کو بہت سی ایسی چیزوں میں پھنسایا ہے جس سے وہ خود گریز کرتے رہے ہیں‘ مثلاً فاسٹ فوڈ وغیرہ۔

یاد رہے اسرائیل میں باقاعدہ سرکاری طور پر فاسٹ فوڈ چھوڑنے کی ترغیب وتشویق دی جاتی ہے۔ یورپ کی ایسی صورتِ حال بنی تو علامہ اقبالؒ جیسا مفکر اِس نتیجہ پر پہنچا کہ ع ’’فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!‘‘ تب یہودیوں نے عالمی قوت کا مرکز لندن سے واشنگٹن منتقل کرالیا‘ کیونکہ امریکہ مستقبل میں عظیم ترین قوت بننے جا رہا تھا‘ جبکہ یورپ اپنی حیثیت کو قائم ودائم رکھنے کے لیے بھی ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ لہٰذا امریکہ کو مغربی یورپ کا مائی باپ بنایا اور خود اپنے سرمائے اور میڈیا کی قوت سے طاقتور امریکہ کے کندھوں پر سوار ہو کر اپنے ایجنڈے کی تکمیل کی طرف رواں دواں ہو گیا اور آج اس حوالے سے کافی سفر طے کر چکا ہے۔ ہماری رائے میں بھارت نادانی وحماقت اور اصلاً اسلام دشمنی میں صہیونیوں کا ایجنٹ بنا ہوا ہے۔ بھارت کا متعصّب ہندو مسلمان دشمنی میں یہ بھول چکا ہے کہ صہیونیوں کا اصل ہدف دُنیا کا واحد حکمران بننا ہے۔ وہ امریکہ اور بھارت کو اپنے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے استعمال کریں گے اور خدانخواستہ اگر صہیونی اپنے مکروہ عزائم کے عین مطابق ایک عالمی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ عربوں‘ ہندوؤں اور امریکیوں کو استعمال شدہ ٹشو پیپر کی طرح ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیں گے۔ یہ اُن کے اس عقیدے کا لازمی جزو ہے کہ اصل اور حقیقی انسان صرف یہودی ہیں‘ باقی

سب Gentile اور Goyim ہیں جو انسان نما شکل رکھتے ہیں۔ اسی لیے وہ غیر یہودیوں کو جانوروں کی طرح ننگا کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارتی ہندو اور عیسائی دنیا تو اُن کے عزائم نہ سمجھتے ہوئے انجانے میں صرف اسلام دشمنی میں ان صہیونیوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں‘ لیکن اُمّتِ مُسلمہ‘ اگر اِس کا وجود کہیں ہے‘ سب کچھ سمجھ کر اور جان بوجھ کر اپنے بدترین دشمنوں کو اپنا دوست بلکہ رہنما بنائے ہوئے ہے۔

اُمّت کو سوچنا چاہیے کہ اُن کی بیٹیوں کو عریاں کیوں کیا جا رہا ہے؟ دخترانِ اسلام کی حیا کس کے ایجنڈے کی تکمیل میں حائل ہے؟ مسلمان مَردوں کی غیرت کو دفن کرنے کی کوشش کیوں ہو رہی ہے؟ اسلام کے چہرے پر بدنما داغ لگانے کے اصل مقاصد کیا ہیں؟ اُمّتِ مُسلمہ کے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ اسلام بحیثیت دین انسانی زندگی کے تین اجتماعی گوشوں میں سے سیاست اور معیشت پر تو صرف راہنما اصول دیتا ہے جبکہ معاشرتی گوشے کو اتنی تفصیل سے قرآن وحدیث کے ذریعے اُمّت پر کیوں واضح کرتا ہے؟ وہ مرد اور عورت کو اپنے اپنے دائرۂ کار میں رہتے ہوئے زندگی گزارنے کا حکم کیوں اتنی سختی سے دیتا ہے؟ وہ صالح معاشرے کے قیام کے لیے کیوں مخلوط مجالس اور بے پردگی سے بچنے کا حکم دیتا ہے؟ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ انسان جس کی سرشت بلکہ فطرت میں حیا رکھی گئی ہے‘ اُس کو مسخ نہ کر دے۔ تمام انسان درحقیقت اس جوڑے کی اولاد ہیں جو بھول کر شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا بیٹھا تھا۔ لیکن اِس بھول سے جب اُس کے پوشیدہ اعضاء ظاہر ہوئے تو اُس نے انتہائی پریشانی سے جنّت کے پتّوں سے اپنے ستر کو چھپایا۔ گویا حیا انسان کا ازلی‘ پیدائشی اور فطری جذبہ ہے‘ جسے دبانا یا ختم کرنا انسان کی فطرت کو مسخ کرنا ہے۔ فطرت دشمن قوتیں انسان کی روحانیت بلکہ اُس کی انسانیت کے درپے ہیں۔ اُمّتِ مُسلمہ کے نام نہاد پاسبانو! ذرا سوچو تو سہی‘ ایک تنہا نہتی لڑکی اپنے نظریے‘ عقیدے اور ایمان کی پختگی کی وجہ سے سینکڑوں مسلّح غنڈوں کو للکارتی ہے تو اُن کے پاس رسوائی بھری پسپائی کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوتا۔ اگر پونے دو ارب پر مشتمل اُمّتِ مُسلمہ ہمّت کر کے اپنے بنیادی نظریے کو دانتوں سے پکڑ لے اور شیطان کے ایجنٹوں کو پوری قوت سے للکارے تو کیا وہ ناکام رہے گی؟

ہمّتِ مَرداں مددِ خدا!!

❁❁❁

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ الْمُمْتَحِنَۃ

تمہیدی کلمات

سورۃ الممتحنہ کا نزول فتح مکّہ سے قبل اسی زمانے میں ہوا جس زمانے میں سورۃ التوبہ کے دوسرے اور تیسرے رکوع کی آیات نازل ہوئی تھیں۔ یہ وہ حالات تھے جب ایک طرف رسول اللہ ﷺ مکّہ پر فیصلہ کن چڑھائی کی تیاری کر رہے تھے تو دوسری طرف منافقین اس ممکنہ مہم کے خلاف پراپیگنڈے میں سرگرم عمل تھے۔ (سورۃ التوبہ کے تمہیدی کلمات میں ان حالات پر تفصیل سے تبصرہ کیا جا چکا ہے۔) ان لوگوں کے بعض دلائل ایسے تھے جن سے نومسلم ضُعفاء بھی کسی نہ کسی حد تک متأثر ہو رہے تھے۔ مثلاً اس حوالے سے ان کی ایک دلیل یہ تھی کہ قریشِ مکّہ جیسے بھی ہیں آخر وہ حرم کے متولی ہیں اور حاجیوں کی خدمت کرتے ہیں‘ لہٰذا اُن کی ان نیکیوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ منافقین کے ایسے اعتراضات کے جوابات سورۃ التوبہ کے دوسرے اور تیسرے رکوع میں دیے گئے ہیں۔

اسی دوران وہ واقعہ بھی رونما ہوا جس کا ذکر اس سورہ کے آغاز میں آیا ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل یوں ہے کہ حضور ﷺ مکّہ پر چڑھائی کا منصوبہ مکمل طور پر خفیہ رکھنا چاہتے تھے‘ تاکہ قریش کو اس بارے میں کوئی پیشگی اطلاع نہ ملنے پائے۔ لیکن ایک صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعہ ؓ سے یہ بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی کہ انہوں نے سردارانِ قریش کو ایک خفیہ خط کے ذریعے اس اہم جنگی راز کی اطلاع کرنے کی کوشش کی۔ حضرت حاطبؓ انتہائی مخلص مسلمان اور بدری صحابی تھے۔ انؓ کے اہل وعیال اور کنبے کے کچھ لوگ اُس وقت تک مکّہ مکرمہ میں تھے۔ انہیں پریشانی لاحق تھی کہ مسلمانوں کی مکّہ پر لشکر کشی کی صورت میں قریش ان کے اہل خانہ کو انتقام کا

نشانہ بنائیں گے۔ اس اندیشے کے پیش نظر انہوں نے حملے کی پیشگی اطلاع دے کر قریشِ مکّہ پر گویا ایک بہت بڑا احسان کیا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید اس احسان کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ ان کے اہل و عیال کو کوئی گزند نہیں پہنچائیں گے۔ حضرت حاطبؓ نے مذکورہ خط ایک عورت کو دیا جو مکّہ جا رہی تھی اور اسے تاکید کی کہ وہ اسے مکمل رازداری سے فلاں شخص تک پہنچا دے۔ اس عورت کے مدینہ سے روانہ ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضور ﷺ کو اس بارے میں مطلع فرما دیا۔ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ‘ حضرت زبیر اور حضرت مقداد بن اسود ؓ کو اس عورت کے پیچھے روانہ کیا‘ انہیں تیزی سے جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ مکّہ کے راستے میں روضۂ خاخ کے مقام پر آپ لوگوں کو ایک عورت ملے گی‘ اس کے پاس ایک خط ہے‘ وہ خط اس سے لے کر واپس آ جاؤ۔ حضرت علی ؓ تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے حضور ﷺ کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچے تو وہ عورت وہاں موجود تھی۔ آپؓ نے خط مانگا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ آپؓ نے فرمایا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی دی گئی اطلاع غلط نہیں ہو سکتی‘ لہٰذا تم سیدھے طریقے سے خط ہمارے حوالے کر دو‘ ورنہ ہم تمہیں برہنہ کر کے تمہاری تلاشی لیں گے۔ اس پر عورت نے خط اپنی چٹیا سے نکال کر آپؓ کے حوالے کر دیا۔ حضور ﷺ نے جب حضرت حاطبؓ کو بلا کر پوچھا تو انہوں نے اعتراف کیا کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ ﷺ میرے معاملے میں جلدی نہ فرمائیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میرے اہل خانہ مکّہ میں مقیم ہیں۔ میں قریش کے قبیلہ کا آدمی نہیں ہوں‘ بلکہ بعض قریشیوں کی سرپرستی میں وہاں آباد ہوا ہوں۔ میرا کوئی قبیلہ وہاں نہیں ہے جو میرے اہل خانہ کو بچا سکے۔ اس لیے مَیں نے یہ خط اس خیال سے بھیجا تھا کہ قریش پر میرا ایک احسان رہے جس کا لحاظ کر کے وہ میرے اہل وعیال کو نقصان نہ پہنچائیں۔ حضرت عمر ؓ موقع پر موجود تھے‘ انہوں نے اٹھ کر عرض کیا: یارسول اللہؐ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن ماردوں‘ اس نے اللہ اور اُس کے رسولؐ اور مسلمانوں سے خیانت کی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں! حاطبؓ سے غلطی ضرور ہوئی ہے‘ لیکن یہ بدری صحابی ہے اور اللہ تعالیٰ بدری صحابہؓ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر چکا ہے‘ امید ہے وہ اس کی یہ خطا بھی معاف فرما دے گا۔ یہ سن کر حضرت عمر ؓ رو دیے اور انہوں نے کہا کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ ہی سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ زیر مطالعہ سورت کی پہلی آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

آیات ۱ تا ۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّیۡ وَ عَدُوَّكُمۡ اَوۡلِیَآءَ
تُلۡقُوۡنَ اِلَیۡهِمۡ بِالۡمَوَدَّةِ وَ قَدۡ كَفَرُوۡا بِمَا جَآءَكُمۡ مِّنَ الۡحَقِّ ۚ
یُخۡرِجُوۡنَ الرَّسُوۡلَ وَ اِیَّاكُمۡ اَنۡ تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ رَبِّكُمۡ ؕ اِنۡ كُنۡتُمۡ
خَرَجۡتُمۡ جِهَادًا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِیۡ ۚ تُسِرُّوۡنَ اِلَیۡهِمۡ
بِالۡمَوَدَّةِ ۚ وَاَنَا اَعۡلَمُ بِمَاۤ اَخۡفَیۡتُمۡ وَ مَاۤ اَعۡلَنۡتُمۡ ؕ وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡهُ
مِنۡكُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ ① اِنۡ یَّثۡقَفُوۡكُمۡ یَكُوۡنُوۡا لَكُمۡ
اَعۡدَآءً وَّ یَبۡسُطُوۡۤا اِلَیۡكُمۡ اَیۡدِیَهُمۡ وَاَلۡسِنَتَهُمۡ بِالسُّوۡٓءِ وَ وَدُّوۡا لَوۡ
تَكۡفُرُوۡنَ ② لَنۡ تَنۡفَعَكُمۡ اَرۡحَامُكُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ ۚ یَوۡمَ
الۡقِیٰمَةِ ۚ یَفۡصِلُ بَیۡنَكُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ③ قَدۡ كَانَتۡ
لَكُمۡ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ فِیۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَ الَّذِیۡنَ مَعَهٗ ۚ اِذۡ قَالُوۡا لِقَوۡمِهِمۡ
اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡكُمۡ وَ مِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرۡنَا بِكُمۡ وَ
بَدَا بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةُ وَالۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ
وَحۡدَهٗۤ اِلَّا قَوۡلَ اِبۡرٰهِیۡمَ لِاَبِیۡهِ لَاَسۡتَغۡفِرَنَّ لَكَ وَ مَاۤ اَمۡلِكُ
لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ رَبَّنَا عَلَیۡكَ تَوَكَّلۡنَا وَ اِلَیۡكَ اَنَبۡنَا وَ
اِلَیۡكَ الۡمَصِیۡرُ ④ رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا فِتۡنَةً لِّلَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا وَاغۡفِرۡ لَنَا
رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَكِیۡمُ ⑤ لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِیۡهِمۡ اُسۡوَةٌ
حَسَنَةٌ لِّمَنۡ كَانَ یَرۡجُوا اللّٰهَ وَ الۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ ؕ وَ مَنۡ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ
اللّٰهَ هُوَ الۡغَنِیُّ الۡحَمِیۡدُ ⑥

آیت ① ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّیۡ وَعَدُوَّكُمۡ اَوۡلِیَآءَ﴾ ''اے اہلِ ایمان! تم میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ''

یعنی تم لوگ کُفّار و مشرکین کی خیر خواہی اور بھلائی کا مت سوچو۔ ان کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنے اور اچھے تعلقات بنانے کی کوشش مت کرو۔ ان آیات کا نزول اس وقت ہوا جب سردارانِ قریش کے نام حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ کا خط پکڑا گیا۔

﴿تُلۡقُوۡنَ اِلَیۡهِمۡ بِالۡمَوَدَّةِ﴾ ''تم ان کی طرف دوستی اور محبّت کے پیغامات بھیجتے ہو''

﴿وَقَدۡ كَفَرُوۡا بِمَا جَآءَكُمۡ مِّنَ الۡحَقِّ ۚ﴾ ''حالانکہ انہوں نے انکار کیا ہے اُس حق کا جو تمہارے پاس آیا ہے۔''

﴿یُخۡرِجُوۡنَ الرَّسُوۡلَ وَاِیَّاكُمۡ﴾ ''وہ رسولؐ کو اور تم لوگوں کو صرف اس بنا پر جلاوطن کرتے ہیں''

﴿اَنۡ تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ رَبِّكُمۡ ؕ﴾ ''کہ تم ایمان رکھتے ہو اللہ اپنے رب پر۔''

﴿اِنۡ كُنۡتُمۡ خَرَجۡتُمۡ جِهَادًا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِیۡ ۚ﴾ ''اگر تم نکلے تھے میرے راستے میں جہاد کرنے اور میری رضا جوئی کے لیے (تو تمہارا یہ طرزِ عمل اس کے منافی ہے)''

﴿تُسِرُّوۡنَ اِلَیۡهِمۡ بِالۡمَوَدَّةِ ۚ﴾ ''تم انہیں خفیہ پیغامات بھیجتے ہو محبّت اور دوستی کے''

﴿وَاَنَا اَعۡلَمُ بِمَاۤ اَخۡفَیۡتُمۡ وَمَاۤ اَعۡلَنۡتُمۡ ؕ﴾ ''اور مَیں خوب جانتا ہوں جسے تم چھپاتے ہو اور جسے تم ظاہر کرتے ہو۔''

﴿وَمَنۡ یَّفۡعَلۡهُ مِنۡكُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ ①﴾ ''اور جو کوئی بھی تم میں سے یہ کام کرے تو وہ یقیناً سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔''

یہ طویل آیت مدنی سورتوں کے عمومی مزاج کی ترجمانی کرتی ہے۔

آیت ② ﴿اِنۡ یَّثۡقَفُوۡكُمۡ یَكُوۡنُوۡا لَكُمۡ اَعۡدَآءً﴾ ''اگر وہ تمہیں کہیں پا لیں تو وہ تمہارے ساتھ دشمنی کریں گے''

﴿وَّیَبۡسُطُوۡۤا اِلَیۡكُمۡ اَیۡدِیَهُمۡ وَاَلۡسِنَتَهُمۡ بِالسُّوۡٓءِ﴾ ''اور تمہاری طرف بڑھائیں گے وہ اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں بُرے ارادے کے ساتھ''

تم تو ان کی طرف دوستی کے پیغامات بھیج رہے ہو، لیکن اگر تم کہیں ان کے ہتھّے چڑھ جاؤ تو

وہ تمہارے ساتھ دشمنی کا ہر حربہ آزمائیں گے‘ تم پر دست درازی بھی کریں گے اور زبان درازی بھی‘ اور تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔

﴿وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ۝۲﴾ ’’اور ان کی شدید خواہش ہوگی کہ تم بھی کافر ہو جاؤ۔‘‘

آیت ۳ ﴿لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ﴾ ’’تمہیں ہرگز نفع نہیں پہنچائیں گے تمہارے رحمی رشتے اور نہ تمہاری اولادیں‘ قیامت کے دن۔‘‘

﴿يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۭ﴾ ’’اللہ فیصلہ کر دے گا تمہارے مابین۔‘‘

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۳﴾ ’’اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔‘‘

آیت ۴ ﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ﴾ ’’تمہارے لیے بہت اچھا نمونہ ہے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں (کے طرزِ عمل) میں۔‘‘

﴿اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۡ﴾ ’’جب انہوں نے اپنی قوم سے برملا کہہ دیا کہ ہم بالکل بَری ہیں تم سے اور اُن سے جنہیں تم پوجتے ہو اللہ کے سوا۔‘‘

ہم تم سے بھی اور ان سے بھی اعلانِ براءت اور اظہارِ لاتعلقی کرتے ہیں۔

﴿كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاۗءُ اَبَدًا﴾ ’’ہم تم سے منکر ہوئے‘ اور اب ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور بغض کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے ہمیشہ کے لیے‘‘

﴿حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ﴾ ’’یہاں تک کہ تم بھی ایمان لے آؤ اللہ پر توحید کے ساتھ‘‘

گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپؑ کے ساتھی اہلِ ایمان (رضی اللہ عنہم) اپنے کافر اعزّہ و اقارب کے لیے ننگی تلوار بن گئے۔ یہاں یہ اہم نکتہ نوٹ کر لیجیے کہ ’’حزبُ اللہ‘‘ والوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں جِدّوجُہد کرتے ہوئے اپنے رحمی رشتوں کو کاٹ پھینکنے کا مشکل مرحلہ بھی لازماً طے کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ المجادلہ کی اس آیت میں واضح کیا گیا ہے: ﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَاۗدُّوْنَ مَنْ حَاۗدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَاۗءَهُمْ اَوْ اَبْنَاۗءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ﴾ (آیت ۲۲) ’’تم نہیں پاؤ گے اُن لوگوں کو

جو حقیقتاً ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور یومِ آخرت پر کہ وہ محبّت کرتے ہوں ان سے جو مخالفت پر کمر بستہ ہیں اللہ کی اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی‘ خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے ہوں یا ان کے بھائی ہوں یا ان کے رشتے دار ہوں‘‘۔ چنانچہ اسی اصول کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپؑ کے اہلِ ایمان ساتھیوں نے اپنی قوم‘ برادری اور رشتہ داروں سے نہ صرف اظہارِ لاتعلقی کیا بلکہ انہیں کھلم کھلا عداوت اور مخالفت کا چیلنج بھی دے دیا۔

﴿اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ﴾ ’’سوائے ابراہیمؑ کے اپنے باپ سے یہ کہنے کے کہ مَیں آپ کے لیے ضرور استغفار کروں گا‘‘

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے والد کے ساتھ اس گفتگو کا حوالہ ہے جس کی تفصیل سورۂ مریم میں آئی ہے۔ اس موقع پر باپ بیٹے کے درمیان جو آخری مکالمہ ہوا وہ یہ تھا: ﴿قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝۴۶ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝۴۷﴾ ’’اُس نے کہا: اے ابراہیم! کیا تم کنارہ کشی کر رہے ہو میرے معبودوں سے؟ اگر تم اس سے باز نہ آئے تو مَیں تمہیں سنگسار کر دوں گا‘ اور تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ ایک مدّت تک۔ ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا: آپ پر سلام! مَیں اپنے رب سے آپ کے لیے استغفار کرتا رہوں گا‘ وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے‘‘۔ آیت زیر مطالعہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسی وعدے کا حوالہ آیا ہے۔

﴿وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ﴾ ’’اور مَیں آپ کے بارے میں اللہ کے ہاں کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا۔‘‘

مَیں آپ کے لیے دعا ضرور کروں گا‘ اللہ تعالیٰ دعا قبول کرے نہ کرے‘ وہ آپ کو معاف کرے نہ کرے‘ یہ اس کا اختیار ہے۔

اس ضمن میں یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ سورۂ مریم کی مذکورہ آیات ہجرت سے پہلے مکّہ میں نازل ہوئی تھیں اور زیر مطالعہ آیت ۸ ہجری میں فتح مکّہ سے قبل نازل ہوئی۔ ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جس وعدے کا ذکر ہے اس سے متعلق آخری حکم سورۃ التوبہ کی اس آیت میں آیا ہے‘ جو ۹ ہجری میں ذیقعدہ کے بعد نازل ہوئی: ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ

اِبْرٰهِیْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِیْمٌ ﴿۱۱۴﴾ ’’اور نہیں تھا استغفار کرنا ابراہیمؑ کا اپنے والد کے حق میں مگر ایک وعدے کی بنیاد پر جو انہوں نے اُس سے کیا تھا‘ اور جب آپؑ پر واضح ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو آپؑ نے اس سے اعلانِ بیزاری کر دیا۔ یقیناً ابراہیمؑ بہت دردِ دل رکھنے والے اور حلیم الطبع انسان تھے‘‘۔ چنانچہ سورۃ التوبہ کی یہ آیت جو ۹ ہجری میں ذیقعدہ کے بعد نازل ہوئی‘ محکم تصوّر ہو گی اور پہلی آیات اس کے تابع سمجھی جائیں گی۔

﴿رَبَّنَا عَلَیْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَیْكَ اَنَبْنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ﴿۴﴾﴾ ’’پروردگار! ہم نے تجھ پر ہی توکّل کیا اور تیری ہی طرف رجوع کیا اور ہمیں تیری طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔‘‘

آیت ۵ ﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ ’’پروردگار! تُو ہمیں کافروں کے لیے تختۂ امتحان نہ بنا دینا‘‘

اے ہمارے پروردگار! ایسا نہ ہو کہ تُو کافروں کو ہمارے ذریعے سے آزمائے۔ ایسا نہ ہو کہ تُو انہیں آزمانے کے لیے ہم پر ظلم کرنے کی چھوٹ دے دے۔ کسی کے لیے فتنہ یا تختۂ مشق بننے کے مفہوم کو حضور ﷺ کے مکّی دور میں مسلمانوں اور مشرکین کی مثال سے سمجھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ مشرکینِ مکّہ کی رسّی دراز کر کے انہیں آزمانا چاہتا تھا کہ ٹھیک ہے تم میرے بندوں پر جتنا ظلم کر سکتے ہو کر لو! میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کس حد تک جاتے ہو! لیکن مشرکین کی اس آزمائش میں تختۂ ستم تو ظاہر ہے مسلمان بنے ہوئے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا میں اللہ تعالیٰ سے ایسی آزمائش سے بچانے کی درخواست کی گئی ہے۔

﴿وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۵﴾﴾ ’’اور تُو ہمیں بخش دے اے ہمارے پروردگار! یقیناً تُو ہی زبردست اور حکمت والا ہے۔‘‘

آیت ۶ ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ ’’تمہارے لیے یقیناً ان (کے طرزِ عمل) میں ایک بہت اچھا نمونہ ہے‘‘

لیکن یہ نمونہ اور اُسوہ فائدہ مند کس کے لیے ہو سکتا ہے؟

﴿لِّمَنْ كَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ ؕ﴾ ’’اُس کے لیے جو اللہ تعالیٰ (سے ملاقات) اور یومِ آخرت کی امید رکھتا ہو۔‘‘

بالکل یہی الفاظ سورۃ الاحزاب میں حضور ﷺ کے اُسوہ کے حوالے سے آئے ہیں:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِیْرًا ﴿۲۱﴾﴾ یعنی حضور ﷺ کی شخصیت اور سیرت یقیناً اُسوۂ کاملہ ہے‘ لیکن اس سے مستفیض صرف وہی لوگ ہو سکیں گے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہوں اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے ہوں۔

﴿وَمَنْ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ﴿۶﴾﴾ ’’اور جو کوئی مُنہ موڑ لے تو یقیناً اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں خود ستودہ صفات ہے۔‘‘

آیات ۷ تا ۹

عَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّجْعَلَ بَیْنَكُمْ وَ بَیْنَ الَّذِیْنَ عَادَیْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ وَ اللّٰهُ قَدِیْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۷﴾ لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ لَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْۤا اِلَیْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ﴿۸﴾ اِنَّمَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ اَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ وَ ظٰهَرُوْا عَلٰۤی اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹﴾

آیت ۷ ﴿عَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّجْعَلَ بَیْنَكُمْ وَبَیْنَ الَّذِیْنَ عَادَیْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ﴾ ’’بعید نہیں کہ اللہ تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جن سے تمہاری دشمنی ہے‘ دوستی پیدا کر دے۔‘‘

ظاہر ہے اگر وہ بھی ایمان لے آئیں گے تو وہ تمہارے بھائی بن جائیں گے‘ جیسا کہ سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱ میں فرمایا گیا: ﴿فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ ؕ﴾ ’’پھر بھی اگر وہ توبہ کر لیں‘ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں‘‘۔ اور یہ مرحلہ کوئی زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ زیرِ مطالعہ آیات فتح مکّہ سے قبل ۸ ہجری میں نازل ہوئیں اور اس سے اگلے ہی سال فتح مکّہ کے بعد ۹ ہجری میں مشرکینِ عرب کو چار ماہ کا الٹی میٹم دے دیا گیا کہ یا ایمان لے آؤ‘ یا سب قتل کر دیے جاؤ گے۔ اس کے نتیجے میں سب لوگ ایمان

لاکر اسلامی بھائی چارے میں شامل ہو گئے۔ آیت زیر مطالعہ میں دوستی اور محبّت کے اسی رشتے کی طرف اشارہ ہے جو ان کے درمیان ایک سال بعد بننے والا تھا۔

﴿وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۷﴾ ''اللہ ہر شے پر قادر ہے اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے۔''

آیت ۸ ﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ﴾ ''اللہ تمہیں نہیں روکتا ان لوگوں سے جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے کبھی جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان کے ساتھ کوئی بھلائی کرو یا انصاف کا معاملہ کرو۔''

یعنی وہ غیر حربی کافر، جن کے ساتھ تمہاری جنگ نہیں ہے، تم لوگوں کو مکّہ سے بے دخل کرنے میں بھی ان کا کوئی کردار نہیں اور نہ ہی انہوں نے تمہارے خلاف تمہارے دشمنوں کی کبھی مدد کی ہے، ایسے لوگوں کے ساتھ احسان اور بھلائی کا سلوک روا رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ دنیوی معاملات کے حوالے سے عدل و انصاف کے تمام تقاضے بھی پورے کرنے چاہئیں۔ البتہ ولایت کا رشتہ اور قلبی محبّت کا تعلق ان کے ساتھ بھی قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝۸﴾ ''بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

آیت ۹ ﴿اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ﴾ ''وہ تو تمہیں منع کرتا ہے اُن لوگوں سے جنہوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں دوسروں کی مدد کی کہ تم ان کے ساتھ ولایت اور دوستی کا رشتہ قائم کرو۔''

﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۹﴾ ''اور جو کوئی ان کے ساتھ دوستی کرے گا تو وہی لوگ ہیں جو ظالم ہیں۔''

اب اگلی آیات میں خواتین سے متعلق چند مسائل کا ذکر آ رہا ہے جو صلح حدیبیہ (۶ ہجری) کے نتیجے میں سامنے آئے تھے۔ صلح حدیبیہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر کوئی مسلمان

مکّہ سے بھاگ کر مدینہ آئے گا تو مسلمان اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے، لیکن اگر مدینہ سے کوئی مسلمان اپنا دین چھوڑ کر واپس مکّہ آ جائے گا تو قریش اسے واپس نہیں کریں گے۔ اس معاہدے کے بعد چند مسلمان خواتین مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئیں تو قریش کی طرف سے مطالبہ آیا کہ انہیں واپس کیا جائے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ معاہدے کی متعلقہ شق مَردوں (رِجَال) سے متعلق ہے، اس میں عورتوں (نِسَاء) کا ذکر نہیں ہے، اس لیے ان خواتین کو واپس نہیں کیا جائے گا۔ اس مثال کے بعد مکّہ سے کچھ مزید خواتین بھی آنا شروع ہو گئیں تو ایسی مہاجر خواتین کے بارے میں تحقیق و تفتیش کی ضرورت محسوس ہوئی۔ خدشہ یہ تھا کہ ہجرت کے نام پر مشرک عورتیں جاسوسی وغیرہ کے لیے مکّہ سے مدینہ آ کر آباد نہ ہو جائیں اور ان کی وجہ سے بعد میں مسلمان معاشرے میں کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو۔ پھر ان میں کچھ ایسی شادی شدہ خواتین بھی تھیں جو اپنے مشرک شوہروں کو چھوڑ کر آ رہی تھیں۔ ان کے بارے میں بھی یہ سوال اپنی جگہ جواب کا متقاضی تھا کہ کیا وہ مسلمان ہو جانے کے بعد بھی مشرک شوہروں کی زوجیت میں ہیں یا کہ آزاد ہو چکی ہیں؟ اور اسی معاملے سے متعلق یہ مسئلہ بھی اہم تھا کہ کسی ایسی عورت کے مدینہ آ جانے کے بعد کیا کوئی مسلمان اس سے نکاح کر سکتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ اگلی دو آیات میں ان مسائل سے متعلق ہدایات دی گئی ہیں۔ جبکہ اس کے بعد ایک آیت میں مسلمان خواتین کی بیعت کا ذکر ہے۔ قرآن مجید میں ذکر تو مَردوں کی بیعت (بیعتِ رضوان) کا بھی ہے، لیکن اس بیعت کے الفاظ کیا تھے یا بیعتِ عَقَبہ اولیٰ اور بیعتِ عَقَبہ ثانیہ کا مضمون کیا تھا؟ یہ تفصیل ہمیں احادیث سے ملتی ہے، قرآن مجید میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ اس لحاظ سے یہاں خواتین کو مَردوں پر ایک طرح سے فضیلت دی گئی ہے کہ آیت ۱۲ میں ان کی بیعت کے حکم کے ساتھ بیعت کا پورا متن بھی دے دیا گیا ہے۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خواتین کو یہ خصوصی انعام ان کے حقوق کے پلڑے کا توازن درست رکھنے کے لیے دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ قوانین و ضوابط اور حقوق و فرائض کی خصوصیت ہی یہی ہے کہ وہ ہر لحاظ سے متوازن ہیں۔ اگر کسی معاملے میں کوئی ایک حکم زیادہ سخت ہو تو اس کے پہلو میں کہیں کوئی نرم قانون بھی موجود ہوتا ہے۔ اگر کہیں کسی کے فرائض کا وزن زیادہ ہو رہا ہو تو اس کے حقوق کے پلڑے میں کچھ مزید ڈال کر اس کی میزان کو برابر کر دیا جاتا ہے۔ میاں بیوی کے حقوق و فرائض ہی کی مثال لے لیں۔ قرآن مجید نے طلاق کا حق صرف خاوند کو دیا ہے، اس کے مقابلے میں بیوی صرف خلع لے سکتی ہے، طلاق نہیں دے سکتی۔

اسی طرح اگر میاں بیوی میں طلاق ہو جائے تو اولاد قانوناً والد کی شمار ہوتی ہے۔ ان دو مثالوں سے خاوند کے حقوق یا اختیارات کا پلڑا غیر معمولی طور پر جھکتا ہوا نظر آتا ہے' لیکن دوسری طرف دیکھیں تو اولاد کے لیے ماں کا حق باپ کے حق کے مقابلے میں تین گنا زیادہ رکھا گیا ہے اور جنّت کی بشارت صرف ماں کے قدموں کے حوالے سے دی گئی ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ اپنے قوانین وضوابط کو متوازن بناتے ہیں اور ہر کسی کے حقوق وفرائض کی ترازو کے ہر دو پلڑوں کو برابر رکھتے ہیں۔

آیات ۱۰' ۱۱

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَ لَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ وَ اٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ وَ لَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَسْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ؕ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۱۰ وَ اِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝۱۱

آیت ۱۰ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ﴾ ''اے اہلِ ایمان! جب تمہارے پاس آئیں مؤمن خواتین ہجرت کر کے تو ان کا امتحان لے لیا کرو۔''

یعنی ہر خاتون سے ضروری حد تک جانچ پڑتال اور تحقیق وتفتیش کر لیا کرو کہ آیا واقعی وہ سچّی اور مخلص مؤمنہ ہے۔

﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ﴾ ''اللہ تو ان کے ایمان کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا ہے۔''

کسی کے دل میں ایمان ہے یا نہیں' اور اگر ہے تو کتنا ایمان ہے' اس کا صحیح علم تو صرف اللہ

تعالیٰ ہی کو ہے۔ تم لوگ اپنے طور پر کسی کے ایمان کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتے۔ لیکن محض ایک احتیاطی تدبیر کے طور پر مناسب طریقے سے کسی نہ کسی درجے میں ایک اندازہ لگانے کی کوشش ضرور کیا کرو کہ ہجرت کرنے والی خواتین کیا واقعی مؤمنات ہیں اور کیا واقعی وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہجرت کر کے مدینہ آئی ہیں۔

﴿فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ﴾ ''پھر اگر تم جان لو کہ وہ واقعی مؤمنات ہیں''

﴿فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ﴾ ''تو انہیں کفّار کی طرف مت لوٹاؤ۔''

﴿لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ﴾ ''نہ اب یہ ان (کافروں) کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ ان کے لیے حلال ہیں۔''

﴿وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ؕ﴾ ''اور ان (کافروں) کو ادا کر دو جو کچھ انہوں نے خرچ کیا تھا۔''

یعنی ان کے کافر شوہروں نے ان کو جو مہر دیے تھے وہ انہیں بھجوا دو۔ اگر کسی مشرک کی بیوی مسلمان ہو کر مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ آ گئی ہے تو اب وہ اس کی بیوی نہیں رہی' ان کے درمیان تعلقِ زوجیت ختم ہو چکا ہے' لیکن عدل وانصاف کا تقاضا یہ ہے کہ مہر کی وہ رقم جو وہ شخص اس خاتون کو اپنی بیوی کی حیثیت سے ادا کر چکا ہے وہ اسے لوٹا دی جائے۔ اس حکم سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام بلاتفریق مذہب وملّت کسی حق دار کا حق اس تک پہنچانے کے معاملے کو کس قدر سنجیدگی سے لیتا ہے۔ اور یہ سنجیدگی یا تاکید صرف قانون سازی کی حد تک ہی نہیں بلکہ حضور ﷺ نے قرآنی قوانین واحکام کے عین مطابق ایسا نظامِ عدل وقسط بالفعل قائم کر کے بھی دکھا دیا جس میں حق دار کو تلاش کر کے اس کا حق اس تک پہنچایا جاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں شام کے محاذ پر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ سپہ سالار تھے۔ انہوں نے رومیوں کے خلاف یرموک کے میدان میں صدی کی سب سے بڑی جنگ لڑی۔ جنگ یرموک کی تیاری کے دوران ایک ایسا مرحلہ بھی آیا جب مسلمانوں کو جنگی حکمت عملی کے تحت کچھ مفتوحہ علاقوں کو خالی کر کے پیچھے ہٹنا پڑا۔ ان علاقوں کی عیسائی رعایا سے مسلمان جزیہ وصول کر چکے تھے۔ جزیہ ایک ایسا ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت اپنے غیر مسلم شہریوں سے ان کے جان ومال کی حفاظت کی ذِمّہ داری کے عوض وصول کرتی ہے۔ اسی لیے یہ ٹیکس ادا کرنے والے شہری ''ذِمّی'' کہلاتے ہیں۔ بہرحال مذکورہ

علاقوں سے مسلمان وقتی طور پر چونکہ واپس جا رہے تھے اور اپنی غیر مسلم رعایا کے جان و مال کی حفاظت کی ذِمّہ داری نبھانے سے قاصر تھے‘ اس لیے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے حکم پر جزیہ کی تمام رقم متعلقہ افراد کو واپس کر دی گئی۔ مسلمانوں کے اس عمل نے عیسائیوں کو اس قدر متاثر کیا کہ ان کے واپس جانے پر وہ لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے رہے۔ یہ ہے اس دین کے نظامِ عدل وقسط کے تحت حق دار کو اس کا حق پہنچانے کی ایک مثال‘ جس کے ماننے والوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ وہ مسلمان عورتوں کے مہر کی رقوم ان کے مشرک شوہروں کو لوٹا دیں۔

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ﴾ ’’اور (اے مسلمانو!) تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم ان خواتین سے نکاح کر لو جبکہ تم انہیں ان کے مہر ادا کر دو۔‘‘

﴿وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ﴾ ’’اور تم کافر خواتین کی ناموس کو اپنے قبضے میں نہ رکھو‘‘

یعنی اگر تم میں سے کچھ لوگوں کی بیویاں ایمان نہیں لائیں اور ابھی تک مکّہ ہی میں ہیں تو تم ان کو اپنے نکاح میں روکے نہ رکھو‘ بلکہ انہیں طلاق دے دو اور انہیں بتا دو کہ اب تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

﴿وَاسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ؕ﴾ ’’اور تم مانگ لو وہ مال جو تم نے (بطورِ مہر) خرچ کیا ہے‘ اور وہ (کافر) بھی مانگ لیں جو کچھ انہوں نے خرچ کیا ہے۔‘‘

یعنی جو مہر تم نے اپنی کافر بیویوں کو دیے تھے وہ تم واپس مانگ لو‘ اور جو مہر کافروں نے اپنی مسلمان بیویوں کو دیے تھے انہیں وہ واپس مانگ لیں۔

﴿ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ؕ﴾ ’’یہ اللہ کا حکم ہے‘ وہ تمہارے مابین فیصلہ کر رہا ہے۔‘‘

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۱۰﴾ ’’اور اللہ سب کچھ جاننے والا‘ کمال حکمت والا ہے۔‘‘

آیت ۱۱ ﴿وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ﴾ ’’اور اگر تمہاری بیویوں (کے مہر میں) سے کچھ کفّار کی طرف رہ جائے‘‘

اس صورت حال کو سمجھنے کے لیے فرض کریں کہ ایک مسلمان مرد ہجرت کر کے مدینہ آ گیا اور

اس کی مشرکہ بیوی مکّہ میں ہی رہ گئی۔ بعد میں اس مسلمان نے اس خاتون کو پیغام بھجوایا کہ میرا تمہارا تعلقِ زوجیت ختم ہو چکا ہے لہٰذا تم مہر کی رقم مجھے لوٹا دو۔ اب اگر اس عورت نے مہر کی رقم واپس نہیں کی تو اس مسئلے کا حل بتایا جا رہا ہے کہ ایسی صورت میں تمہیں کیا کرنا ہے۔

﴿فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا ؕ﴾ ’’تو جب تمہیں موقع ہاتھ آ جائے تو جن لوگوں کی بیویاں جاتی رہی ہیں انہیں اتنی رقم ادا کر دو جتنی انہوں نے خرچ کی ہے۔‘‘

اگر کسی جنگ سے تمہیں کچھ مالِ غنیمت ملے تو اس میں سے ان لوگوں کو تلافی کے طور پر کچھ مال دے دو جن کی بیویاں ایمان نہ لانے کی وجہ سے ان کی زوجیت میں نہیں رہیں اور وہ انہیں مہر کی رقوم بھی لوٹانے کو تیار نہیں‘ تاکہ اس رقم سے مہر ادا کر کے وہ لوگ مکّہ سے ہجرت کر کے آنے والی ان خواتین سے نکاح کر سکیں جن کے مشرک خاوند مکّہ میں رہ گئے ہیں۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝۱۱﴾ ’’اور اُس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جس پر تمہارا ایمان ہے۔‘‘

آیات ۱۲‘ ۱۳

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۲ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ۝۱۳

آیت ۱۲ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ﴾ ’’اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب آپ کے پاس آئیں مؤمن خواتین آپ سے بیعت کرنے کے لیے‘‘

اب آگے بیعت کا وہ متن دیا گیا ہے جس کا ذکر سطورِ بالا میں ہوا تھا:

﴿عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا﴾ ''اس بات پر کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گی''

﴿وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ﴾ ''اور نہ چوری کریں گی' نہ بدکاری کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی''

﴿وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ﴾ ''اور نہ وہ کوئی بہتان باندھیں گی جو اُن کے ہاتھوں اور پاؤں کے مابین سے ہو''

یعنی یہ کہ وہ کسی پر زنا کی تہمت نہیں لگائیں گی' کوئی جنسی سکینڈل نہیں گھڑیں گی۔ اس تہمت کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کوئی عورت کسی مرد پر الزام لگا دے کہ اُس نے اس کی آبروریزی کی ہے۔ ایسے الزامات انبیاء کرام علیہم السلام پر بھی لگتے رہے ہیں۔ اس بیعت کی آخری شق یہ ہے کہ:

﴿وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ﴾ ''اور وہ آپؐ کی نافرمانی نہیں کریں گی معروف میں''

﴿فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۲﴾ ''تو (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ ان سے بیعت لے لیں اور ان کے لیے استغفار کریں۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا' بہت رحم کرنے والا ہے۔''

احادیث میں بیعتِ عَقبہ اولیٰ کا جو مضمون ملتا ہے وہ بھی خواتین کی اس بیعت کے مضمون سے ملتا جلتا ہے' اسی لیے بیعتِ عَقبہ اولیٰ کو ''بیعت النساء'' بھی کہا جاتا ہے۔ بیعتِ عَقبہ اولیٰ کے زمانے تک اہلِ ایمان چونکہ ایک باقاعدہ جماعت کی شکل میں منظّم نہیں ہوئے تھے اس لیے اس بیعت کے مضمون میں جماعتی نظم وضبط سے متعلق کوئی شق موجود نہیں۔ اسی طرح ہمارے ہاں صوفیاء اپنے عقیدت مندوں سے جو 'بیعتِ ارشاد' لیتے ہیں اس کا مضمون بھی تقریباً انہی نکات پر مشتمل ہوتا ہے کہ مَیں شرک نہیں کروں گا' چوری نہیں کروں گا' بدکاری نہیں کروں گا' وغیرہ۔ گویا بیعتِ عَقبہ اولیٰ' بیعتِ خواتین اور بیعتِ ارشاد تینوں کا مضمون تقریباً ایک ہی ہے۔ البتہ وہ بیعت جس کی بنیاد پر مسلمان باقاعدہ ایک جماعت کے طور پر منظّم ہوئے وہ بیعتِ عَقبہ ثانیہ ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ ایک متفق علیہ حدیث میں اس بیعت کے مضمون کا

پورا متن موجود ہے۔ حضرت عبادہؓ بن صامت روایت کرتے ہیں: بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ کہ ہم نے بیعت کی تھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ اس بات پر کہ ہم آپؐ کا ہر حکم سنیں گے اور اطاعت کریں گے فِي الْعُسْرِ تنگی اور مشکل میں بھی وَالْيُسْرِ اور آسانی میں بھی وَالْمَنْشَطِ اور اس حالت میں بھی کہ ہماری طبیعتوں میں انشراح ہو کہ ہاں یہ کام واقعی بہت مفید ہے اور درست ہے وَالْمَكْرَهِ اور اس حالت میں بھی کہ ہمیں اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے۔ یعنی ہمیں کسی فیصلے سے اتفاق نہ ہو تب بھی ہم آپؐ کا فیصلہ مانیں گے۔ وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا اور اس کے باوجود کہ دوسروں کو ہم پر ترجیح دے دی جائے۔ یعنی ہمارے مقابلے میں اگر کسی نووارد کو بھی امیر بنا دیا جائے گا تب بھی ہم اعتراض نہیں کریں گے۔ وَعَلٰى اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ اور جنہیں آپؐ ذِمّہ دار یا امیر بنائیں گے ان سے ہم جھگڑا نہیں کریں گے' بلکہ ان کا ہر حکم مانیں گے[1]۔ وَعَلٰٓى اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا اور یہ کہ ہم حق بات ضرور کہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں گے لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ[2] اور ہم کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کے خوف سے اپنی زبان بند نہیں کریں گے۔

بیعتِ عَقبہ ثانی کے اس مضمون کو ہم نے صرف ایک فقرے کے اضافے کے ساتھ تنظیم اسلامی کی بیعت کے لیے اختیار کیا ہے اور وہ اضافی فقرہ یہ ہے: اُبَايِعُ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْمَعْرُوْفِ کہ مَیں بیعت کرتا ہوں اس بات پر کہ ہر وہ حکم سنوں گا اور مانوں گا جو شریعت

۱۔ اطاعتِ اُمراء کے حوالے سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان بہت اہم ہے:

((مَنْ اَطَاعَنِيْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ، وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ، وَمَنْ اَطَاعَ اَمِيْرِيْ فَقَدْ اَطَاعَنِيْ، وَمَنْ عَصٰى اَمِيْرِيْ فَقَدْ عَصَانِيْ))

''جس نے میری اطاعت کی اُس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی' اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے میرے (مقرر کیے ہوئے) امیر کی اطاعت کی اُس نے گویا میری اطاعت کی اور جس نے میرے (مقرر کیے ہوئے) امیر کی نافرمانی کی اُس نے گویا میری نافرمانی کی''۔ (صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب یقاتل من وراء الامام ویتقی به۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة...)

۲۔ صحیح البخاری' کتاب الاحکام' باب کیف یبایع الامام الناس' وکتاب الفتن' باب قول النبی ﷺ سترون بعدی امورا تنکرونها۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة...

کے دائرے سے باہر نہ ہو! آج ایسی کسی بھی بیعت کے لیے اس فقرے کا اضافہ اس لیے ضروری ہے کہ حضور ﷺ کی اطاعت تو مطلق تھی‘ آپؐ کا تو ہر حکم ہی معروف کے دائرے میں تھا‘ لیکن آپؐ کے بعد کسی بھی شخصیت کی مطلق اطاعت پر بیعت کرنا درست نہیں۔ اسی لیے حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ نے بھی خلیفہ بننے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو بیعت لی وہ بھی مشروط تھی۔ یعنی آپؓ کی بیعت کرنے والا ہر شخص آپؓ کا صرف وہی حکم ماننے کا پابند تھا جو قرآن و سُنّت کے دائرے کے اندر ہو۔

بیعتِ عَقبہ ثانیہ کے مذکورہ مضمون کا تعلق ایک جماعت اور تنظیم کے نظم ونسق سے ہے۔ چنانچہ اسی بیعت کی بنیاد پر حضور ﷺ نے ایک مضبوط جماعت منظّم فرمائی اور مدینہ منورہ میں بارہ نقیب (نو قبیلہ خزرج اور تین قبیلہ اوس سے) مقرر فرما کر اہلِ ایمان کی جماعت کے ذیلی تنظیمی ڈھانچے کی بنیاد بھی رکھ دی۔ اس سے پہلے مسلمانوں کی تعداد بھی کم تھی اور تمام اہلِ ایمان مکّہ کی حدود میں ہی رہتے تھے۔ مکّہ ایک چھوٹا سا شہر تھا اور اہلِ ایمان کے امیر یا سربراہ کی حیثیت سے حضور ﷺ خود شہر میں موجود تھے۔ اس لیے کوئی نقیب یا ذیلی امیر مقرر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب مسلمان مکّہ سے دور مدینہ میں بھی موجود تھے اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ بھی ہو رہا تھا اس لیے وہاں حضور ﷺ نے الگ تنظیمی ڈھانچہ تشکیل فرمایا۔

جماعتی زندگی میں عملی جِدّوجُہد کے دوران چونکہ جہاد وقتال کے مراحل بھی آتے ہیں اور ایسے مراحل میں خواتین بالواسطہ طور پر ہی حصّہ لیتی ہیں‘ اس لیے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے روایت کردہ متن کے مطابق خواتین سے بیعتِ جہاد نہیں لی گئی‘ بلکہ ان سے آیت زیر مطالعہ کے مضمون کے مطابق ہی بیعت لی گئی کہ وہ فلاں فلاں اَفعال نہیں کریں گی اور حضور ﷺ جو بھی بھلائی کا حکم دیں گے اس کی نافرمانی نہیں کریں گی۔

ہمارے ہاں تنظیم اسلامی میں بھی خواتین سے بیعت کے لیے بعینہٖ یہی الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو اس آیت میں آئے ہیں۔ دراصل خواتین کی بیعت سے مقصود یہ نہیں کہ وہ بھی غلبۂ دین کی جِدّوجُہد میں مَردوں کی طرح عملی کردار ادا کریں یا جہاد وقتال میں حصّہ لیں‘ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ جماعتی زندگی کے ساتھ تعلق کی بنا پر ﴿كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ کے حکم کی مصداق بن کر جماعتی زندگی کے فیوض وبرکات سے وہ بھی بہرہ ور ہوتی رہیں اور جماعتی زندگی کے لزوم سے متعلق احکامات پر بھی ان کا عمل ہوتا رہے۔ لزومِ جماعت کے حوالے سے حضور ﷺ

کی درج ذیل احادیث بہت قطعی اور واضح ہیں:

(۱) ((عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ، وَاِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ، فَاِنَّ الشَّيْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ، وَهُوَ مِنَ الْاِثْنَيْنِ اَبْعَدُ))[۳]

’’تم پر جماعت کی شکل میں رہنا فرض ہے‘ اور تم تنہا مت رہو‘ اس لیے کہ اکیلے شخص کا ساتھی شیطان بن جاتا ہے‘ لیکن اگر دو (مسلمان) ایک ساتھ رہیں تو وہ دُور ہو جاتا ہے۔‘‘

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((يَدُ اللّٰهِ مَعَ الْجَمَاعَةِ، ومَنْ شَذَّ شَذَّ اِلَى النَّارِ))[۴]

’’اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے‘ اور جو شخص خود کو جماعت سے کاٹ لیتا ہے وہ آگ میں ڈالا جائے گا۔‘‘

جماعتی زندگی کی اہمیت اور ’’جماعت‘‘ کے ڈسپلن سے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان بھی بہت واضح ہے:

اِنَّـهٗ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ وَلَا جَمَاعَةَ اِلَّا بِاِمَارَةٍ وَلَا اِمَارَةَ اِلَّا بِطَاعَةٍ[۵]

’’یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام نہیں ہے بغیر جماعت کے‘ اور کوئی جماعت نہیں ہے بغیر امارت کے‘ اور امارت کا کوئی فائدہ نہیں اگر اس کے ساتھ اطاعت نہ ہو۔‘‘

بہرحال جماعت سازی کا مسنون‘ منصوص اور ماثور طریقہ بیعت کا طریقہ ہی ہے‘ لیکن آج کل اکثر دینی جماعتوں نے یہ مسنون طریقہ ترک کر کے دوسرے طریقے اپنا لیے ہیں۔ اگرچہ رائج الوقت سب طریقے بھی مباح ہیں‘ لیکن ظاہر ہے مباح اور سُنّت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی لیے ہم نے تنظیم اسلامی کی اساس بیعت کے نظام پر رکھی ہے۔ اس پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اُس نے ہمیں اس اہم سُنّت کو زندہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی جو آج کل جماعت سازی کے حوالے سے بالکل متروک ہو چکی تھی۔

آیت ۱۳ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ ’’اے اہلِ ایمان! ان لوگوں کے ساتھ دوستی مت کرو جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا ہے‘‘ (باقی صفحہ 69 پر)

۳۔ سنن الترمذی‘ کتاب الفتن‘ باب ماجاء فی لزوم الجماعة۔
۴۔ سنن الترمذی‘ کتاب الفتن‘ باب ماجاء فی لزوم الجماعة۔
۵۔ سنن الدارمی‘ المقدمة‘ باب فی ذهاب العلم۔

روشن خیالی اور اسلام

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

۸/اپریل ۲۰۰۵ء کا خطابِ جمعہ بمقام: مسجد دارالسلام، باغ جناح، لاہور

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رَسولہِ الکریم ... امّا بَعد:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝﴾ (بنی اسراء یل)

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ مِنْ مَّاۗءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَاۗبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝﴾ (البقرة)

﴿اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ۭ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝﴾ (لقمان) ... صدق اللّٰہُ العظیم

میرے آج کے خطاب کا عنوان ''موجودہ روشن خیالی اور اسلام'' ہے۔ اس موضوع پر چند ہی روز قبل تنظیم اسلامی ایک بڑا سیمینار بھی منعقد کر چکی ہے، جس میں بعض علماء کرام کے ساتھ جدید روشن خیالی کے ایک بہت بڑے علمبردار ڈاکٹر جاوید اقبال بھی شریک ہوئے۔ مَیں نے بھی وہاں پر گفتگو کی تھی، لیکن اپنے ایک گھنٹے کے خطاب کے دوران مجھے ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کی باتوں کا جواب بھی دینا پڑا، کیونکہ وہ تقریب میری صدارت میں ہو رہی تھی۔ نتیجتاً اصل موضوع پر مَیں زیادہ تفصیل سے اظہارِ خیال نہ کر سکا۔

میرا دعویٰ یہ ہے کہ دنیا میں روشن خیالی کا آغاز اسلام، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں قرآن مجید سے ہوا ہے۔ اس سے پہلے دنیا توہمات میں مبتلا تھی۔ ایسے عقائد موجود تھے جن کا کوئی سر پیر نہ تھا۔ زلزلہ کے متعلق کہا جاتا کہ یہ زمین ایک بیل اپنے ایک سینگ پر اُٹھائے کھڑا ہے، جب بیچارہ بیل تھک کر اسے اپنے دوسرے سینگ پر منتقل کرتا ہے تو زلزلہ آتا ہے۔ کیا اس عقیدے کی کوئی عقلی یا سائنسی بنیاد ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کسی کتاب میں اس کا ذکر ہے؟ اس قسم کے توہمات سے انسان کو قرآن نے نکالا ہے۔ اس ضمن میں قرآن کی سب سے پہلی اور بنیادی ہدایت یہ تھی کہ:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝﴾ (بنی اسراء یل)

''اور مت پیچھے لگو کسی ایسی چیز کے جس کے لیے تمہارے پاس علم نہیں ہے۔ بے شک کان اور آنکھ اور دماغ، ان سب کی اس سے پوچھ ہوگی۔''

یعنی یہ جو ہم نے تمہیں سماعت اور بصارت دی ہے اور ان دونوں کے جو sense data دماغ میں فیڈ ہوتے ہیں، ان سب کا تم سے محاسبہ ہوگا۔ پوچھا جائے گا کہ اس سے کام کیوں نہیں لیا، توہمات میں کیوں پڑے رہے! علم کی ایک قسم وہ ہے جسے ہم کسبی علم (Acquired Knowledge) کہتے ہیں اور اسے انسان خود حاصل کرتا ہے۔ آنکھ سے دیکھا، کان سے سنا، ہاتھ سے چھوا، زبان سے چکھا، ناک سے سونگھا، یہ sense data دماغ میں فیڈ ہو گئے۔ اس آیت میں لفظ ''فُؤاد'' کے معنی مَیں دماغ لیتا ہوں، قلب نہیں۔ فُؤاد کے معنی کسی چیز سے اس کا نچوڑ حاصل کرنا ہیں۔ پرانی تفاسیر کے اندر ''ف'' لکھا ہوتا ہے، یعنی اس بات کا فائدہ کیا ہے! اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے! اس سے کیا عملی سبق ملتا ہے! گوشت کو جب اچھی طرح بھون دیتے ہیں اور اس میں سے پانی نکل جاتا ہے تو عربی میں اسے فئید کہتے ہیں، یعنی اس کا جوہر نکل آیا۔ اس اعتبار سے حواسِ خمسہ میں سے سماعت اور بصارت ہمارے سب سے بنیادی حواس ہیں۔ انہی سے زیادہ تر ڈیٹا فیڈ ہوتا ہے۔ کمپیوٹر کے حوالے سے ڈیٹا کا لفظ تو آج کل تقریباً ہر شخص ہی جانتا

ہے۔ کمپیوٹر اپنے طور پر قطعاً کچھ نہیں سوچ سکتا۔ آپ اس میں ڈیٹا فیڈ کرتے ہیں‘ وہ اس کو پراسس کرتا ہے‘ پراسس کر کے نتیجہ نکالتا ہے‘ نتیجہ نکال کر اسے میموری کے اندر رکھ دیتا ہے۔ پھر مزید ڈیٹا آتا ہے تو اس پر غور کرتا ہے۔ ایک نیا نتیجہ آنے پر اس کا پچھلے نتیجے سے موازنہ کرتا ہے کہ آیا اس کے خلاف ہے یا اس کے مطابق!

اس طرح قدم بقدم انسان کا علم بھی بڑھتا چلا گیا‘ جس کی مَیں بڑی سادہ سی مثال دیا کرتا ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے آباء و اَجداد کی خوراک پھل‘ جڑی بوٹیاں اور جڑیں ہوتی تھیں‘ یا پھر کچا گوشت کھاتے جیسے کہ درندے کھاتے ہیں۔ ایک روز کسی شخص نے دیکھا کہ اوپر سے ایک پتھر نیچے چٹان پر گرا تو ایک شعلہ برآمد ہو گیا۔ اس نے دو پتھر لے کر ٹکرائے تو توانائی کی پہلی شکل (first form of energy) یعنی آگ ایجاد ہو گئی۔ اب انسان نے سبزیاں اور گوشت پکا کر کھانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد کسی نے دیکھا کہ چولھے پر چڑھی ہوئی ہانڈی کے اوپر ڈھکن ہل رہا ہے۔ اس نے سوچا کیا یہ کسی جِن بھوت کا کام ہے! غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ڈھکن کے نیچے جو بھاپ موجود ہے اس میں طاقت ہے‘ وہ ڈھکن کو اٹھا رہی ہے۔ لہٰذا توانائی کا دوسرا ذریعہ (second source of energy) وجود میں آ گیا۔ اب سٹیم انجن ایجاد ہو گئے۔ لہٰذا انسان کا علم قدم بقدم بڑھا ہے۔

پہلے اس کی رفتار کافی سست تھی‘ لیکن پچھلے کوئی ڈیڑھ سو سال میں یہ دھماکے کی مانند نہایت تیزی کے ساتھ بڑھی ہے۔ علم بہرحال علم ہے‘ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ علم نہیں ہے۔ قرآن مجید اسے علم الاسماء سے تعبیر کرتا ہے۔ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (البقرۃ:۳۱) کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ سارا علم حضرت آدم علیہ السلام میں ودیعت کر دیا گیا تھا جو آج تک انسان نے اپنے حواس اور عقل کے ذریعے سے حاصل کیا ہے اور جو وہ ابھی حاصل کرے گا۔ جیسے آم کی گٹھلی میں پورا درخت ہوتا ہے‘ تاہم اسے درخت بننے میں کئی سال لگتے ہیں‘ لیکن جو کچھ اس میں تھا‘ یہ سب اُسی سے بن رہا ہے۔ یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس علم کے حصول کے لیے آلات اور اوزار (apparatus) آدم میں رکھ دیے

گئے‘ جیسے سمع‘ بصر‘ فُؤاد‘ کہ اب ان سے کام لو اور آگے بڑھتے جاؤ۔ یہ علم آج اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ جیسے اقبال نے کہا تھا کہ ع

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے!

تو چاند پر تو انسان اُتر گیا‘ آگے مریخ پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ بہرحال یہ علم ہے۔ اسلام اسے تسلیم (acknowledge) کرتا ہے‘ بلکہ جو آیت مَیں نے پڑھی ہے وہ اسی علم سے متعلق ہے۔ دوسری قسم کا علم وہ ہے جو ہمیں وحی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے‘ یعنی علم ہدایت‘ لیکن اس وقت یہ میرا اصل موضوع نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ علم کی بنیاد پر اپنا موقف قائم کرو! ہمارے نزدیک وہ علم یا تو سائنس کے ذریعے سے حاصل شدہ ہو گا‘ یا پھر وحی کے ذریعے سے آیا ہوا ہو گا۔

دوسری بات قرآن نے یہ کہی کہ جتنے مظاہرِ فطرت ہیں‘ مثلاً چاند‘ ستارے‘ آسمان‘ ہواؤں کا چلنا‘ ان میں سے کسی میں الوہیت نہیں ہے کہ تم ان کو پوجو۔ یہ تو اللہ کی آیات اور نشانیاں ہیں۔ ان کو دیکھو اور اللہ کے علم‘ اُس کی قدرت‘ اُس کی حکمت کا اندازہ کرو‘ سمجھ اور معرفت حاصل کرو! اس سلسلے میں طویل ترین آیت سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶۴ ہے: ﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ﴾ ”یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں“ ﴿وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ﴾ ”اور اُس کشتی میں جو سمندر (اور دریاؤں) میں چلتی ہے لوگوں کے لیے نفع بخش سامان کو لے کر“ ﴿وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ﴾ ”اور یہ جو آسمان سے اللہ نے پانی اُتارا ہے“ ﴿فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ ”پھر مُردہ زمین کو اس کے ذریعے سے زندہ کر دیا“ (زمین بنجر پڑی تھی‘ اب سرسبز ہے)۔ ﴿وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ﴾ ”اور ہر طرح کے چوپائے اس میں پھیلا دیے“ ﴿وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ﴾ ”اور ہواؤں کی گردش میں“ ﴿وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ ”اور اُن بادلوں میں جو زمین و آسمان کے درمیان مسخر

ہیں‘‘ (زمین پر گرتے نہیں) ﴿لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾﴾ ’’یقیناً نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں‘‘۔ ان سب میں آیات ہیں‘ نشانیاں ہیں۔ ان کو دیکھو اور عقل سے کام لو۔ تم نے ہوا کو خدا بنالیا‘ آگ کو خدا بنالیا‘ سورج کو خدا بنالیا‘ چاند کو خدا بنالیا۔ معاذ اللہ! یہ تو اللہ کی نشانیاں ہیں۔ ان کو دیکھو اور اللہ کو پہچانو۔

اسی سے دراصل دنیا میں پہلی بار استقرائی منطق (Inductive logic) کا رواج ہوا۔ اس سے پہلے صرف استخراجی منطق (Deductive logic) تھی کہ آدمی ایک بات کو لے کر اُسی کے اندر گم ہے۔ اسے High power lense کے نیچے رکھ کر بال کی کھال اتارتا جا رہا ہے۔ مشاہدہ محدود‘ عقل کی تگ و دو مسلسل! دوسری طرف استقرائی منطق ہے۔ قرأ سے مراد جمع کرنا ہے۔ اسی سے قریہ بنا‘ اسی سے قرآن بنا اور اسی سے استقراء بنا۔ استقرائی طریقے کے تحت مشاہدات کو جمع کر کے نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ بقول اقبال ؎

کھول آنکھ‘ زمیں دیکھ‘ فلک دیکھ‘ فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

سورۃ الغاشیہ میں دعوتِ مشاہدہ اِن الفاظ میں دی گئی: ﴿اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾﴾ کیا یہ دیکھتے نہیں کہ اونٹ جس پر یہ سواری کرتے ہیں‘ اُس کو کیسے بنایا اللہ نے! یہ ریگستان اُس کے لیے کس قدر موزوں ہے۔ سات سات دن پانی نہ ملے‘ اسے پرواہ نہیں۔ کوئی چیز کھانے کو نہ ملے‘ پرواہ نہیں۔ اس کے کوہان میں اتنی چربی ہے جو اسے غذا مہیّا کرتی رہتی ہے۔ پاؤں ایسا بنایا کہ ریت میں دھنستا نہیں۔ اللہ نے تمہارے ماحول کے کس قدر مطابق تمہیں یہ سواری عطا کی! ﴿وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾﴾ اور دیکھتے نہیں آسمان کو کہ کیسے بلند کر دیا گیا! ﴿وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾﴾ اور دیکھتے نہیں ان پہاڑوں کو کیسے جما دیا گیا‘ نصب کر دیا گیا! یہ خاص طور پر عرب کا مشاہدہ تھا۔ وہ عام طور پر وادیوں میں سفر کرتے تھے۔ حجاز کے اِدھر بھی پہاڑ ہیں اور اُدھر بھی‘ جبکہ درمیان میں راستہ ہے۔ ﴿وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾﴾ اور زمین کی طرف نہیں دیکھتے کہ اس کو کیسے ہموار کر دیا گیا! اِن چیزوں کو

دیکھو اور نتیجہ نکالو۔ چنانچہ استقرائی منطق کا آغاز قرآن نے کیا اور اسی سے سائنس وجود میں آئی۔ سائنس کی بنیاد اسی طریقۂ استدلال پر ہے‘ جبکہ اس سے پہلے افلاطون‘ ارسطو اور دوسرے فلاسفہ سب کے سب استخراجی منطق میں لگے رہتے تھے۔

اب مَیں ایک بنگالی ہندو راجہ مہندر ناتھ رائے کا نظریہ پیش کرنے لگا ہوں۔ ایم این رائے انٹرنیشنل کمیونسٹ پارٹی کی بلند ترین سطح پر قائم ایک تنظیم ’’کمیونسٹ انٹرنیشنل‘‘ کا رُکن تھا۔ اس نے لاہور میں ۱۹۲۰ء میں ’’Historical Role of Islam‘‘ کے عنوان سے ایک لیکچر دیا تھا‘ جس میں اُس نے بڑی ہی خوبصورت بات کہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ مسلمانوں نے چوبیس برس کی قلیل مدّت میں طوفان کی طرح جو فتوحات حاصل کیں‘ اِدھر دریائے جیحوں (Oxus) اور اُدھر بحر الکاہل تک پہنچ گئے‘ تو اکثر لوگ ان فتوحات کی برق رفتاری کا موازنہ دوسرے فاتحین سے کر بیٹھتے ہیں۔ جیسے چنگیز خان مشرق سے چلتا ہوا مغرب میں پہنچ گیا تھا‘ اٹیلا بھی مشرق سے مغرب تک پہنچ گیا تھا‘ اسی طرح سکندر اعظم بھی مقدونیہ سے چل کر دریائے بیاس تک آ گیا تھا۔ لیکن ان تمام فاتحین کی اور مسلمانوں کی فتوحات میں بڑا بنیادی فرق ہے۔ چنگیز خان اور سکندر اعظم کی فتوحات کے نتیجے میں کوئی نئی تہذیب وجود میں نہیں آئی‘ دنیا کو روشنی نہیں ملی‘ نئے علوم کی ایجاد نہیں ہوئی‘ جبکہ مسلمانوں کی فتوحات نے ایک نئی تہذیب اور تمدن کو جنم دیا‘ تمام پرانے علوم کو دوبارہ زندہ کر دیا۔

اُس وقت یورپ تاریک دَور (Dark Ages) سے گزر رہا تھا۔ اگرچہ ہر ملک کا اپنا بادشاہ تھا‘ لیکن سب کے اوپر پوپ تھا اور اصل حکومت اُسی کی تھی۔ ہر معاملے میں اُسی کا حکم چلتا تھا‘ اور اس نے سائنس اور فلسفہ کی تعلیم کو حرام قرار دے رکھا تھا۔ اُس کا حکم تھا کہ اگر کہیں سے سائنس کی کتابیں نکل آئیں تو اس گھر کو آگ لگا دی جائے‘ کسی نے فلسفہ پڑھا ہے تو اس کو زندہ جلا دیا جائے۔ پوپ جو کہہ دیتا‘ بس وہی قانون تھا۔ تورات کا جو قانون حضرت مسیح علیہ السلام دے کر گئے تھے اس کو تو سینٹ پال نے منسوخ (abrogate) کر دیا۔ کوئی شریعت نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد تو پوپ کا حکم ہی شریعت کا درجہ اختیار کر گیا۔ اس اعتبار سے پورا یورپ پوپ کے زیر اثر تھا۔ امریکہ کا تو اُس وقت وجود ہی نہیں تھا۔

اگر تھا بھی تو دنیا نہیں جانتی تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ وہاں وحشی قبائل رہتے تھے جو کسی طرح کی تہذیب و تمدن سے نا آشنا تھے۔ اس سے پہلے یونانی دور میں یورپ متمدّن رہا تھا اور وہاں فلسفہ اور سائنس کے میدان میں کافی ترقی ہوئی تھی' لیکن پوپ کے تسلّط نے تاریکی پیدا کر دی تھی۔ ایم این رائے کے مطابق' ایسے حالات میں مسلمانوں نے دنیا کو روشنی دی ہے۔ اس حوالے سے روشن ترین عہد عباسی دورِ حکومت کا تھا' جس میں قدیم یونان کے تمام علوم کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ سقراط' افلاطون اور ارسطو کو مسلمانوں نے ہی زندہ کیا ہے۔ اسی طرح ہندوستان سے علمِ طب بھی لیا' منطق بھی لی اور حساب بھی لیا۔ پھر اُن علوم کو وسعت اور ترقی بھی دی گئی۔ لہٰذا اُس وقت پوری دنیا کے اندر روشن خیال معاشرہ مسلمانوں کا تھا۔ یہ ایک ایسے شخص کی رائے ہے جو ہندو بھی تھا اور کمیونسٹ بھی۔

تیسری بات علامہ اقبال نے فرمائی ہے' جو بہت گہری ہے اور یہ صرف وہی کہہ سکتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"The inner core of the present Western Civilization is Quranic."

ایک طرف تو علامہ اقبال مغربی تہذیب کی شدید مذمت کرتے ہیں۔ جیسے: ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ناپائیدار ہوگا!

اور: ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!

لیکن دوسری طرف کہتے ہیں کہ اس تہذیب کا بطن البطون (Inner core) قرآنی ہے۔ سائنس میں موجودہ ترقی اسی وجہ سے ممکن ہوئی ہے کہ مسلمانوں نے توہمات کا دور ختم کر دیا تھا۔ استقرائی منطق شروع ہوئی تو سائنس وجود میں آئی۔ اب دیکھیے کہ یہ سب کچھ ہوا کس طرح ہے۔

جب بنو عباس نے مسلم دنیا کے قلب میں قائم بنو اُمیّہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تو ان کا ایک شہزادہ بچ کر وہاں سے نکل بھاگا۔ اس نے سپین جا کر وہاں ایک زبردست حکومت

قائم کر لی' جسے مسلمان پہلے ہی فتح کر چکے تھے۔ سپین کو طارق بن زیاد نے ۹۲/ ۹۳ ہجری (۷۱۲/ ۷۱۳ء) میں فتح کیا تھا۔ اس موقع پر یہودیوں نے مسلمانوں کی مدد کی تھی اور انہیں راستے بتائے تھے' کیونکہ مسلمان فوج کسی نامعلوم مقام پر اُتر گئی تھی اور اپنی کشتیاں بھی جلا چکی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب یہودیوں کو عیسائیوں کی جانب سے شدید تعذیب (persecution) کا سامنا تھا۔ اُن پر تشدد ہوتا تھا' انہیں ٹارچر کیا جاتا تھا' ان سے نفرت کی جاتی تھی۔ عیسائی ان سے گھن کھاتے تھے' لہٰذا انہیں شہروں میں آباد ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کے لیے شہروں سے باہر اقلیتی محلے (Ghettos) قائم تھے۔ شام کو انہیں دو تین گھنٹوں کے لیے شہر میں آنے کی اجازت تھی تاکہ وہ خرید و فروخت کر سکیں۔ ان اوقات کے علاوہ شہر میں ان کا داخلہ بند ہوتا۔ پھر انہیں زندہ بھی جلا دیا جاتا تھا' خاص طور پر سپین میں۔ اُس وقت سپین سو فی صد رومن کیتھولک ملک تھا' اور آج بھی ایسا ہی ہے۔ بہرحال مسلمانوں نے سپین میں اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد یہودیوں کو اپنا محسن سمجھا۔ لہٰذا انہیں کندھوں پر اٹھایا' سر پر بٹھایا اور بہت عزّت و توقیر دی۔ اسی لیے بن گوریان نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ:

"Muslim Spain was the golden era of our Diaspora."

''مسلم سپین ہمارے 'دورِ انتشار' کا سنہری زمانہ تھا۔''

سن ۷۰ء میں یہودیوں کو رومیوں نے فلسطین سے نکال دیا تھا اور وہ دنیا بھر میں منتشر ہو گئے تھے۔ جس کے جہاں سینگ سمائے چلا گیا۔ چنانچہ یہ روس' شمالی افریقہ' ہندوستان اور ایران چلے گئے۔ یہ یہود کی تاریخ کا دورِ انتشار (Diaspora) کہلاتا ہے' جو انتہائی ذلّت کا دور تھا۔ یہودی کا لفظ ہر جگہ ایک گالی بن چکا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے سپین میں ان کو سہارا دیا' لیکن یہاں بیٹھ کر یہودیوں نے کیا کیا' اسے اچھی طرح جان لیجیے!

علم و حکمت کی وہ روشنی جو مشرقِ وسطیٰ کے اندر پیدا ہوئی تھی' وہ مسلمانوں کے ذریعے ہسپانیہ میں بھی پہنچ گئی۔ ہسپانیہ کے تمام بڑے شہروں میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ جیسے آج ہمارے نوجوان پڑھنے کے لیے یورپ اور امریکہ جاتے ہیں' ایسے ہی

اُن کے نوجوان Pyrenees کی پہاڑیوں کا سلسلہ عبور کر کے فرانس‘ اٹلی اور جرمنی سے ہسپانیہ آتے اور یہاں سے اسلام کی روشنی لے کر جاتے تھے۔ یہ حریت‘ آزادی اور مساوات کی روشنی تھی‘ یعنی کوئی حاکم نہیں‘ سب اللہ کے محکوم ہیں۔ ع ’’تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے!‘‘ تمام انسان پیدائشی طور پر برابر ہیں۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں۔ کوئی گورا کسی کالے سے اور کوئی کالا کسی گورے سے برتر نہیں۔ اسلام نے دنیا کو اخوتِ انسانی کا بہت اعلیٰ پیغام دیا کہ تم سب کے سب ایک ہی جوڑے کی اولاد ہو۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى﴾ ’’اے لوگو! یقیناً ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا‘‘ یعنی آدم اور حوا علیہما السلام سے۔ ﴿وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ﴾ ’’اور تمہیں تقسیم کر دیا قوموں اور قبیلوں میں‘ تاکہ تم ایک دوسرے کا تعارف حاصل کرو (ایک دوسرے کو پہچانو)۔‘‘ دنیا بھر کے انسانوں کی شکلیں بھی بدل دیں‘ رنگ بھی بدل دیے۔ یہ سب تعارف کے لیے ہے‘ کسی کو برتر ثابت کرنے کے لیے نہیں۔ ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ﴾ (الحجرات:۱۳) ’’درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزّت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے‘‘۔ جو بھی تم میں سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے‘ برائی سے بچتا ہے‘ لوگوں کے حقوق تلف نہیں کرتا‘ لوگوں کی عزّت سے نہیں کھیلتا وہی اللہ کے ہاں باعزّت ہے۔

علم کے یہ دھارے سپین سے پورے یورپ کو جا رہے تھے‘ لیکن یہودی اُن میں سیاہی گھول رہے تھے۔ بقول شاعر ع ’’کون سیاہی گھول رہا ہے وقت کے بہتے دریا میں!‘‘ چونکہ انہیں عیسائیوں سے انتقام لینا تھا‘ لہٰذا انہوں نے اس میں زہر گھولا۔ وہ اس طرح کہ آزادی کو مادر پدر آزادی بنا دیا‘ یعنی اخلاقی اقدار سے بھی آزادی‘ شرم و حیا سے بھی آزادی‘ سرمائے کے حصول اور استعمال کی آزادی۔ پھر خدا سے آزادی کے نتیجے میں سیکولرازم پیدا کر دیا کہ ریاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی مسجد جائے یا مندر‘ سینیگاگ میں جائے یا چرچ میں لیکن نظامِ ریاست‘ قانونِ ملکی‘ نظامِ معاشرت میں کسی

مذہب کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔ یہ ہے سیکولرازم کی بنیاد! یہ بیج اس لیے بوئے گئے کہ سیکولرازم یہودیوں کے لیے بہت مفید تھا۔ ظاہر ہے اگر اکثریتی مذہب کی بنیاد پر کسی ملک کا نظام تشکیل پائے گا تو اقلیتی مذاہب کے افراد میں تفریق کی جائے گی۔ ایک عیسائی ریاست کا نظام مکمل طور پر عیسائیت ہی ہوگا اور یہودی وہاں دوسرے درجے کا شہری ہوگا‘ جس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ لہٰذا انہوں نے سیکولرازم کے ذریعے سب کو برابر کر دیا کہ ایک ملک کی حدود میں رہنے والے سب برابر کے شہری ہیں‘ چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان‘ سکھ ہوں یا عیسائی‘ پارسی ہوں یا یہودی۔ اس اعتبار سے وہ اوپر آ گئے اور عیسائیوں کے ہمسر‘ ہم پلہ‘ ہم کفو ہو گئے۔

اس کے نتیجے میں یورپ میں دو تحریکیں چلی ہیں۔ ایک تحریک احیاء علوم (Renaissance)‘ جس کے تحت جن علوم کے اوپر پوپ نے ڈھکن رکھا ہوا تھا وہ اٹھا دیا گیا کہ فلسفہ پڑھو‘ سائنس بھی پڑھو‘ استقراء کرو‘ نتیجے نکالو۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ سورج گردش کر رہا ہے‘ زمین ساکن ہے۔ پھر ایک دور آیا جس میں کہا گیا کہ سورج ساکن ہے‘ زمین اس کے گرد گھوم رہی ہے۔ اس کے بعد ایک دور آیا جس میں انسان پر یہ منکشف ہوا کہ کائنات کے تمام ستارے اور سیارے گردش میں ہیں۔ اور یہ حقیقت قرآن پہلے سے بیان کر چکا ہے: ﴿وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝۴۰﴾ (یٰسٓ) کہ کائنات کی ہر چیز حرکت میں ہے۔ لہٰذا دیکھو‘ غور کرو‘ سوچتے رہو۔ اسی طرح قرآن نے کہا: ﴿اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ...﴾ (لقمٰن:۲۰) ’’کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں موجود ہر چیز کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے‘‘۔ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی ساری چیزوں کو تمہارا خدمت گار بنایا ہے۔ سورج اور چاند تمہارے خدمت گار ہیں‘ تم انہیں مسخر کر سکتے ہو‘ ان کے ذریعے سے توانائی اور قوتیں حاصل کرو۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ آج سورج سے توانائی حاصل کی جا رہی ہے۔ شمسی توانائی سے بجلی بنانے اور کاریں چلانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ یہ چیزیں تمہارے فائدے کے لیے ہیں۔ یہ تو تمہاری خادم ہیں‘ لیکن تم نے انہیں خدا بنا دیا!

یوں یورپ میں سائنس اور فلسفہ کا فروغ ہوا۔ یورپ میں دوسری تحریک اصلاحِ مذہب (Reformation) کی چلی‘ جس کے نتیجے میں مذہب اور پاپائیت سے بغاوت ہوگئی۔

یہودیوں نے تیسرا کام یہ کیا کہ سود کو جائز کر دیا۔ جب تک پوپ کا نظام تھا‘ پورے یورپ کے اندر سود حرام تھا۔ انفرادی سطح پر مہاجنی سود اور تجارت میں کمرشل انٹرسٹ دونوں حرام تھے۔ پروٹسٹنٹ طبقہ نے پوپ کے خلاف احتجاج کیا اور سب سے پہلے اپنا چرچ علیحدہ کر لیا۔ یوں برطانیہ میں ’’چرچ آف انگلینڈ‘‘ وجود میں آیا۔ سب سے پہلا بینک ’’بینک آف انگلینڈ‘‘ بھی برطانیہ میں قائم ہوا۔ یہ بھی یہودیوں کی ایجاد تھی۔ بقول علّامہ اقبال: ؎

ایں بنوک ایں فکرِ چالاکِ یہود
نورِ حق از سینۂ آدم ربود

یہ بینک یہود کی عیاری والی فکر کی پیداوار ہیں جس نے آدم کے اندر روحِ ربّانی (Divine Spark) کا خاتمہ کر دیا۔

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام!

جب تک اس سودی نظام کا خاتمہ نہیں ہوگا‘ بینکوں کی بساط نہیں لپیٹی جائے گی‘ اُس وقت تک نہ تہذیب کا کوئی معاملہ ہوسکتا ہے‘ نہ دانش کا اور نہ دین کا۔

قرآن نے یہ کہا تھا کہ پیدائشی طور پر تمام انسان مساوی ہیں‘ کوئی گھٹیا یا اعلیٰ نہیں۔ ہاں‘ بعد میں ایک شخص علم زیادہ حاصل کر لیتا ہے‘ ایک شخص متقی زیادہ بن جاتا ہے‘ یہ اکتسابی (acquired) چیزیں ہیں۔ پیدائشی طور پر مرد اور عورت بھی برابر ہیں۔ ﴿بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ﴾ (آل عمران:۱۹۵)۔ ایک ہی باپ کے نطفے سے بیٹی بھی ہے بیٹا بھی‘ اور ایک ہی ماں کے رحم میں پرورش پائی ہے بیٹے نے بھی اور بیٹی نے بھی۔ اس حیثیت میں بیٹا افضل نہیں ہے۔ مرد کی قوامیت گھر کے انتظامی معاملات کے اندر اور خاندان کی سربراہی کے حوالے سے ہے۔ یہود نے اسے نہیں مانا اور معاشرتی سطح پر مرد اور عورت کو برابر ٹھہرایا۔ یہ مساوات کا وہ غلط تصوّر تھا جس نے خاندانی نظام کو تہ و بالا کر دیا۔ ڈارون

نے انسان کی حیثیت یہ معیّن کی کہ وہ بھی نرا حیوان ہی ہے۔ چمپینزی اور انسان میں کیا فرق ہے! بس یہی جو گدھے اور گھوڑے میں ہے۔ ایک refined animal ہے‘ ایک ذرا coarse ہے۔ تو پھر یہ شرم و حیا‘ عصمت و عفت تم کہاں سے لے آئے ہو؟ انسان حیوانوں کی طرح جیسے چاہے اپنی تسکین کرے۔ یہ امر خالصتاً ذاتی نوعیت کا ہے کہ کوئی مرد‘ مرد سے تسکین حاصل کر لے اور عورت‘ عورت سے تسکین حاصل کر لے‘ یا ایک مرد مختلف عورتوں سے آزادی کے ساتھ جب چاہے تسکین حاصل کرے۔ پیاس لگے تو جہاں سے چاہو پانی پی لو۔ خوامخواہ یہ بندھن بنا دیے گئے ہیں اور عورت کو تابع کر دیا گیا ہے۔ یہ تو مساواتِ مَرد و زن کے نظریے کے خلاف ہے۔ انہیں گھروں سے نکالو اور بازاروں‘ مارکیٹوں اور سیاست کے اندر لاؤ۔ اس طرح ان تینوں چیزوں یعنی شوہر اور بیوی کی حیثیت سے مساوات‘ طلاق کا مساوی حق اور وراثت میں برابری کا معاملہ‘ اس نے وہاں کے خاندانی نظام کا بیڑا غرق کر دیا۔

اس پوری کائنات میں شر کے منبع اور سرچشمہ شیطانِ لعین کا انسانوں میں سب سے بڑا ایجنٹ یہودی ہے‘ اور یہود کا سب سے بڑا آلۂ کار پروٹسٹنٹ عیسائی ہے‘ خصوصاً وائٹ اینگلو امریکن پروٹسٹنٹس اور وائٹ اینگلو سیکسن پروٹسٹنٹس (WASP)۔ انہی کے ذریعے سے یہودیوں نے چرچ کو علیحدہ کرایا‘ انہی کے ذریعے سے سود کی اجازت لی اور بینک آف انگلینڈ بنایا۔ یہ تہذیب یورپ میں پھیلتی چلی گئی۔ پوپ کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوگئی‘ کیونکہ انہوں نے بہت دبا کر رکھا تھا کہ سائنس پڑھو نہ فلسفہ۔ تو ردِّعمل کے طور پر مذہب سے بغاوت پیدا ہوئی اور مذہب دشمنی کا رویہ فروغ پانے لگا۔ مذہب کو کسی شخص کے ذاتی فعل تک محدود کر دیا گیا۔ کوئی شخص اپنے گھر میں نماز پڑھے‘ روزہ رکھے یا کسی قسم کی کوئی اور عبادت کرے‘ لیکن ریاست کے سیاسی‘ معاشرتی اور معاشی نظام (Politico-Socio-Economic System) سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں ہوگا‘ چاہے وہ اسلام ہو یا عیسائیت‘ یہودیت ہو یا کوئی اور عقیدہ۔ یورپ میں یہ تہذیب پروان چڑھی ہے جس کی بنیاد سیکولرازم‘ سود پر مبنی سرمایہ داری اور لذّت پرستی (hedonism) پر ہے۔

اس دوران علم کی دوسری آنکھ بند کر دی گئی اور وحی کی جانب بالکل نہیں دیکھا گیا۔ لہٰذا دنیا میں یہ دجالیت قائم ہوئی ہے۔ سیکولرازم کے تحت مذہب کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں سے بالکل ختم کر دیا گیا۔ سود کے ذریعے یہودیوں نے پہلے یورپ کو جکڑا تھا' اب وہ چاہتے ہیں کہ پوری انسانیت ہمارے قبضے میں آ جائے۔ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف جیسے ادارے اسی لیے وجود میں لائے گئے ہیں۔ اب گلوبلائزیشن ہو رہی ہے' TRIPS کا معاہدہ آ رہا ہے۔ پہلے نوآبادیاتی استعمار میں کوئی طاقت جنگ کے ذریعے کوئی سرزمین فتح کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کرتی تھی' لیکن پھر اس کے خلاف بغاوت بھی ہوتی تھی۔ جیسے ۱۸۵۷ء میں برعظیم میں ہوا جس کے نتیجے میں کافی انگریز مارے گئے۔ چنانچہ مسلسل محاذ آرائی کی کیفیت رہتی۔ اب وہ کہتے ہیں کہ وہاں جا کر قبضہ کرنے کا کیا فائدہ! ہمیں تو وہاں سے معاشی مفادات حاصل کرنا ہیں' اس لیے پوری دنیا کو ان بینکوں کے جال میں جکڑ لو۔ پوری دنیا کام کرے لیکن اس کی کمائی کی بالائی ہم سود کے ذریعے سے کھینچ لیں گے۔ یہ فنانشل کلونیلزم ہے جو اِس وقت دنیا کے اندر اپنی جکڑ بندی کر رہا ہے۔ گلوبلائزیشن جب پورے عروج پر آ جائے گی' جب TRIPS کا معاہدہ ہو جائے گا تو ملک بے معنی ہو جائیں گے۔ حکومتوں کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہو گی' اصل میں ملٹی نیشنل کمپنیاں حکومت کر رہی ہوں گی۔ وہ اپنے مینیجرز کو جو تنخواہیں دیتی ہیں' سرکاری ملازمت میں اس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ درحقیقت یہود کا وہ سارا نظام ہے جس نے پہلے یورپ کو جکڑا' پھر امریکہ کو اور اب وہ پوری دنیا کو جکڑنا چاہتا ہے۔

بدقسمتی سے اسی تہذیب کو آج ہم بھی چاہتے ہیں۔ ہمارے صدر سمیت حکومتی حلقوں میں سیکولر ذہن رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ وہ سود کو جائز سمجھتے ہیں' انہیں اس میں کوئی غلط بات نظر نہیں آتی۔ اسی طرح بے حیائی کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ صدر صاحب نے صاف کہہ دیا ہے کہ جو لوگ لڑکیوں کی ننگی رانیں نہیں دیکھ سکتے وہ اپنی آنکھیں بند کر لیں' ٹی وی کو آف کر دیں۔ ہم تو خواتین کو کرکٹ بھی کھلائیں گے اور ہاکی بھی۔ جو انہیں نیکروں میں نہیں دیکھ سکتا وہ نہ دیکھے۔ اسمبلیوں میں ۳۳ فیصد سیٹیں دے کر ہم ایک دم چالیس ہزار

عورتوں کو گھروں سے نکال کر میدان میں لے آئے ہیں۔ یہودیوں کا جو پروگرام اس وقت دنیا میں چل رہا ہے' ان کے اوّلین آلۂ کار برطانیہ اور امریکہ ہیں۔ یہ دونوں یک جان دو قالب (Hand in glove) ہیں۔ باقی عیسائی دنیا بھی ان کے تابع ہو چکی ہے۔ اب یہ اس کو گلوبلائز کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جو بھی ان کی تعلیم پا کر آتا ہے' ان کی تہذیب کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ ایسے تمام افراد اُن کے ایجنٹ ہیں' چاہے وہ عرب ہوں یا غیر عرب' ہندوستانی ہوں یا پاکستانی۔ ان کی برین واشنگ کی جا چکی ہے۔ بقول شاعر: ؎

اُس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے' کیا رہائی ہے!

انہوں نے یہاں کی سول سروس اور فوج کی ایک خاص نہج پر تربیت کی ہے۔ وہ اگرچہ چلے گئے ہیں لیکن درحقیقت by proxy حکومت انہی کی ہو رہی ہے۔ انہی کے غلام' کاسہ لیس اور انہی کے جوتوں کی ٹو چاٹنے والے اس وقت عالمِ اسلام پر حکمران ہیں۔

آج اس تہذیب کو پوری دنیائے اسلام میں جو شخص سب سے بڑھ کر فروغ دینے کی کوشش کر رہا ہے' وہ ہمارے صدر پرویز مشرف ہیں۔ ان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مَیں انہیں اس بات کا کریڈٹ دیتا ہوں کہ جو بات ان کے ذہن میں ہوتی ہے وہ بلا جھجک کہہ دیتے ہیں۔ انہوں نے اقتدار سنبھالتے ہی کہہ دیا تھا کہ میرا آئیڈیل اتاترک ہے۔ اتاترک نے تو عربی اذان بھی بند کرا دی تھی' عربی میں نماز پڑھنا اور خواتین کا برقع اوڑھنا ممنوع ٹھہرایا تھا جبکہ انگریزی لباس پہننا لازم کر دیا تھا۔ پرویز مشرف صاحب کے بچپن کا کچھ حصّہ ترکی میں گزرا ہے۔ وہ ترکی زبان بھی جانتے ہیں۔ ان کے والد ترکی میں پاکستان کے سفارت خانے میں کسی عہدے پر فائز تھے۔ اس اعتبار سے وہ جو کچھ کر رہے ہیں یقیناً اُس کے مطابق ہے جو انہوں نے پہلے دن کہا تھا۔ انہوں نے ۳۳ فیصد عورتوں کو اسمبلیوں میں بٹھانے کا جو قدم اٹھایا ہے' ایسا تو آج تک دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہوا۔ کسی مسلمان ملک تو کجا' امریکہ میں نہیں ہے جو جمہوریت کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ ہندوستان میں بھی نہیں ہے' جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں جمہوریت کا

ہونا ایک معجزہ ہے۔ خواندگی کی شرح اتنی کم ہے لیکن پھر بھی جمہوریت کام کر رہی ہے۔ وہاں پہلے دن جو گاڑی دستور کی پٹڑی پر چلنی شروع ہوئی تھی' وہ آج تک چل رہی ہے۔ وہاں کبھی کوئی فوجی حکومت نہیں آئی۔ ایک بار تھوڑے سے عرصے کے لیے ایمرجنسی لگی تھی' لیکن وہ بھی کوئی بالائے دستور کام نہیں تھا۔ وہاں یہ کبھی نہیں ہوا کہ ایک آیا تو سارا دستور ختم کر کے اپنا بنا رہا ہے' دوسرا آیا تو پھر سارا دستور ختم کر کے ججوں سے پی سی او کے تحت حلف اٹھوا رہا ہے۔ یہ کھیل پاکستان میں ہوا ہے۔ اب سب سے بڑھ کر انہوں نے یہ کیا ہے کہ عورتوں کو گھر سے نکالو' انہیں میدان کے اندر لاؤ۔ جو نہیں دیکھنا چاہتے وہ آنکھیں بند کر لیں۔ قدامت پرست' انتہا پسند لوگ یہ چاہتے ہیں کہ عورت کا جسم ڈھکا رہے' یہ چاہتے ہیں کہ عورت برقعے اور پردے کے ساتھ گھر سے نکلے۔ ان دقیانوسی اور تاریک خیال ملاؤں کے پیروکاروں کا زمانہ گزر گیا۔ یہ اگلے وقتوں کے لوگ ہیں۔ روشن خیالی ہر حال میں ہوگی۔ جیسے کبھی اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا کہ: ؎

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پانیئر میں چھپے

اسی طرح آج تہذیب وہ ہے جو یورپ کی ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا کہ اس کا inner core اسلامی اور قرآنی ہے' لیکن اس کے گرد جو غلاف چڑھا دیے گئے ہیں وہ انتہائی خطرناک ہیں۔ اس آزادی کو مادر پدر آزاد بنا دیا گیا ہے کہ اللہ سے بھی آزاد' اخلاقی حدود و قیود سے بھی آزاد' شرم و حیا کی قیود سے بھی آزاد' سرمایہ آزاد۔ سرمایہ کو کھل کھیلنے دو' سود کے اوپر جاتا ہے تو ٹھیک ہے۔ آج اس سارے نظام کا نام روشن خیالی ہے' حالانکہ یہ تاریک ترین خیال ہے۔ انسان اپنی عظمت اور اشرف المخلوقات کے منصب سے حیوانیت کی طرف رجوع کر رہا ہے۔

موجودہ تہذیب کے Quranic core کے اوپر جو پردے چڑھائے گئے ہیں' مَیں نے آج تجزیہ کر کے آپ کو بتا دیا ہے کہ ان کا تاریخی پس منظر کیا ہے۔ یہ کس نے چڑھائے' کیوں چڑھائے اور اس کا سب سے بڑا فائدہ کس کو ہوا! اس کے نتیجے میں

یہودی جو دنیا کے اندر اقلیت میں تھے' آج برابر کے شہری بن چکے ہیں اور پوری دنیا کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ اب یہ سیلاب یو این او کے ذریعے آ رہا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ سیکولرازم تو ہم نے پوری دنیا کے اندر قائم کر دیا۔ اسی طرح سود پر مبنی بینکنگ پوری دنیا میں قائم ہو گئی۔ البتہ شرم و حیا' خاندانی نظام' کچھ اخلاقی اقدار اور شادی بیاہ کی کچھ حیثیت عالمِ اسلام میں ابھی باقی ہے۔ اسی لیے ہنٹنگٹن نے کہا تھا کہ اب تہذیبوں کا تصادم ہوگا۔ جب یو ایس ایس آر کا خاتمہ ہوا تو ایک بڑے امریکی فلسفی اور پولیٹکل سائنٹسٹ فوکویاما نے ''End of History'' کے نام سے کتاب لکھی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اب ثابت ہو گیا ہے کہ ہمارا نظام ہی بہترین نظام ہے۔ ہمارے معاشی نظام کے مقابلے میں کمیونزم آیا تھا' اس کی لاش پڑی سڑ رہی ہے۔ ہماری تہذیب سب سے اعلیٰ ہے' کوئی ہمارے مقابلے میں نہیں۔ اس کے بعد ہنٹنگٹن نے لکھا کہ نہیں' فوکویاما کو مغالطہ ہوا ہے' ابھی تہذیبوں کا تصادم ہوگا۔ اس نے کہا کہ ٹائن بی کے مطابق پوری تاریخ انسانی میں بیس تہذیبیں پیدا ہوئیں' ان میں سے بارہ مر چکی ہیں' اب دنیا میں صرف آٹھ تہذیبیں باقی ہیں۔ ایک ہماری تہذیب ہے' اس کے علاوہ سات اور ہیں۔ ان سات میں سے بھی پانچ کو ہم آسانی سے اپنے اندر جذب کر لیں گے' البتہ دو ذرا لوہے کے چنے ثابت ہوں گی۔ ان میں سے ایک اسلامی تہذیب ہے اور دوسری چین کی کنفیوشس تہذیب۔

ایسی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے اس نے مشورہ دیا کہ ایک تو چین کا رُخ مغرب کی طرف نہ ہونے دو' اس لیے کہ چین کے مغرب میں عالمِ اسلام ہے۔ اس کا رجحان مشرق کی طرف رکھو۔ چنانچہ اسی تجویز پر ایشیا پیسیفک اکنامک کوآپریشن (APEC) کی تنظیم قائم ہوئی۔ دوسرا مشورہ اس نے یہ دیا تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کو ابھارو' انہیں لڑاؤ۔ اس طرح یہ ہمارے مدِمقابل نہیں بن سکیں گے۔ چنانچہ ہمارے ملک میں جو مذہبی فسادات ہوتے ہیں ان کی نوعیت مکمل طور پر مقامی نہیں ہے' بلکہ یہ ایک بہت بڑی عالمی سازش کا نتیجہ ہیں۔ کچھ لوکل سازشیں بھی ہیں۔ ''را'' اور ''موساد'' کا کام بھی ہے۔ کچھ ایران اور سعودی عرب کے درمیان ہونے والی کشاکش کا بھی مظہر ہے' لیکن سب

سے بڑھ کر یہ ایک عالمی سازش بھی ہے۔ چنانچہ اب ہم پر یو این او کے ذریعے حملہ کیا جا رہا ہے۔ پہلے قاہرہ کانفرنس ہوئی' پھر بیجنگ کانفرنس' اس کے بعد بیجنگ پلس فائیو کانفرنس۔ یہ سب اقوام متحدہ کے ادارے کے زیر اہتمام منعقد ہوئیں۔ ان کی سفارشات اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پاس ہوئی ہیں اور اسے اب ''سوشل انجینئرنگ پروگرام آف دی یونائیٹڈ نیشنز آرگنائزیشن'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مشرقی معاشرے کی دقیانوسی بنیادوں کو منہدم کر دیا جائے۔ ایک بوسیدہ عمارت کو گرا کر ہی وہاں دوسری عمارت بن سکے گی۔ چنانچہ مشرق کی تہذیب کو گرایا جا رہا ہے تاکہ مغربی تہذیب اوپر چھا جائے۔

اس ضمن میں ہماری موجودہ حکومت سب سے بازی لے گئی ہے۔ پوری اسلامی دنیا میں ہمارے حکمران اس نئی تہذیب کے سب سے بڑے آلۂ کار ہیں۔ ان کے نزدیک سیاست سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ سود کی حرمت کی بات کرنے پر کہا جاتا ہے کہ پرانی دنیا کی باتیں کرتے ہو' آج تو یہی چلے گا۔ حکومت کی پوری پالیسی کو امریکہ ڈکٹیٹ کر رہا ہے۔ نائن الیون کے بعد ہم نے ایک دم جو یوٹرن لیا تھا' اس سے ہر چیز تلپٹ ہو گئی ہے۔ پہلے ہم کشمیریوں کی پشت پناہی کر رہے تھے' اب ہمارے سب سے بڑے اتحادی (ally) سید علی گیلانی کا بیان آ گیا ہے کہ پاکستان جال میں پھنس گیا ہے۔ ہمارا ہمیشہ سے یہ موقف رہا ہے کہ پہلے کشمیر کا مسئلہ حل کرو' پھر باقی معاملات کو معمول پر لانے کا عمل شروع ہو گا لیکن آج Normalization قدم بقدم بڑھتی جا رہی ہے اور ایک وقت آئے گا کہ یہ لکیریں بے معنی ہو جائیں گی۔ سرحد پار سے جو لوگ بھی آتے ہیں' یہی کہتے ہیں کہ یہ لکیر مٹا دینی چاہیے اور ہمیں باہم مل جانا چاہیے۔ دو مرتبہ مشرقی پنجاب کا وزیر اعلیٰ آ کر یہ کہہ گیا ہے کہ ہمیں ایک ہو جانا چاہیے۔ ایڈوانی نے پہلی مرتبہ کہا تھا کہ کنفیڈریشن ہو جانی چاہیے۔ امریکی وزیر خارجہ کنڈولیزا رائس نے اپنے حالیہ دورے کے بعد واپس جا کر یہ بیان دیا ہے کہ ہمیں اور بھارت کو **سٹریٹیجک** اعتبار سے مشورہ کرنا ہو گا کہ پاکستان کا مستقبل کیا ہو! باقی دنیا کہہ رہی ہے یہ غیر مستحکم ہو جائے گا' بلکہ اس کے دنیا کے نقشے سے مٹ جانے کا امکان ہے۔

ایک اور بات بھی سامنے آئی ہے جو بڑی چشم کشا ہے۔ قومی ڈائجسٹ کی ایک حالیہ اشاعت میں پاکستان کے سابق سیکریٹری خارجہ اور مسلم لیگ (ن) کے اہم رہنما اکرم ذکی کا انٹرویو شائع ہوا ہے' جس میں انہوں نے کہا ہے کہ یہ لکھ کر رکھ لو' ہندوستان بہت جلد پاکستان پر ایک بڑا حملہ کرے گا۔ میری تو یہ رائے نہیں بنتی' اس لیے کہ جب گُڑ کھلا کر مارا جا سکتا ہو تو زہر دینے کی ضرورت کیا ہے! پاکستان تو خود ہی اُن کے جال میں پھنس رہا ہے۔ آج کشمیری مجاہدین اور حریت پسندوں کے ہم اور بھارت دونوں مشترکہ دشمن ہو گئے ہیں۔ دونوں نے ان کی مذمت کی ہے۔ کشمیریوں کا موقف یہ ہے کہ پہلے مسئلہ کشمیر حل کراؤ' اس کے بعد یہ آنا جانا اور تعلقات میں گرم جوشی شروع ہو۔ یہی موقف ہمیشہ سے پاکستان کا بھی رہا ہے۔ اس جِدّوجُہد میں کشمیریوں نے اتنی جانیں دے دیں! ہمارے کتنے نوجوانوں نے یہاں سے جا کر وہاں پر موت کو سینے سے لگایا ہے! کیا یہ قربانیاں اس لیے تھیں کہ اپنے موقف سے پیچھے ہٹ جائیں؟

اس ضمن میں آخری بات یہ کہوں گا کہ ہماری مذہبی جماعتوں کا کردار بہت مشکوک اور غلط ہے۔ میرے نزدیک وہ اس چیز کے مجرم ہیں کہ جب پاکستان میں پہلی مرتبہ خواتین کو ۳۳ فیصد نمائندگی دینے کا فیصلہ ہوا تو کسی نے اس کے خلاف بیان تک نہیں دیا۔ دراصل ان کی گھٹی میں انتخابات ایسے پڑ گئے ہیں کہ انہوں نے سوچا اگر ہم نے کوئی مظاہرہ کیا یا اس کے خلاف آواز اٹھائی تو کہیں انتخابات ہی ملتوی نہ ہو جائیں۔ اب بھی انہوں نے جو ''کاروانِ جمہوریت'' چلایا ہے' یہ ''کاروانِ اسلام'' تو نہیں ہے۔ جب عوامی تحریک چلانی ہو تو ساری بے اطمینانیوں کو جمع کرنا پڑتا ہے۔ اگر قیمتیں بڑھ رہی ہیں تو کوئی آج سے تو نہیں بڑھ رہیں۔ پٹرول کی قیمت بڑھ رہی ہے' یہ تو تدریجاً بڑھتی رہی ہے۔ سندھ کے اندر بے اطمینانی ہو رہی ہے۔ بلوچستان میں تو بے اطمینانی کا باپ ہو رہا ہے۔ مذہبی حلقے میں بھی بے اطمینانی ہے' کیونکہ روشن خیالی کے نام سے جو کچھ آ رہا ہے یہ انہیں پسند نہیں ہے۔ ان ساری بے اطمینانیوں کو جمع کریں گے تو کوئی موومنٹ بنے گی نا! پاکستان قومی اتحاد (P.N.A) میں اسلام پسند جماعتوں کے ساتھ انتہائی سیکولر عناصر بھی جمع ہو گئے

تھے۔ ایئر مارشل اصغر خان‘ پیر پگاڑا‘ ولی خان سے بڑا سیکولر کوئی ہوگا! یہ سب پی این اے میں تھے۔ جب اسے بپتسمہ دیا گیا اور نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی تحریک بنایا گیا‘ تب لوگوں نے جانیں دی ہیں۔ جمہوریت کے نام پر پاکستان میں کوئی جان نہیں دے گا۔

متحدہ مجلس عمل کیا ہے؟ ایک مہمل سا نام ہے۔ متحدہ مجلس عمل کے معنی کیا ہیں؟ کا ہے کا عمل؟ اس میں اسلام کا نام تک نہیں۔ حکومت کی طرف سے اتنا بڑا اقدام اٹھایا گیا اور یہ چپ بیٹھے رہے۔ جنرل پرویز مشرف نے ہمارے سیاسی اور معاشرتی نظام کے اندر اتنی بڑی چھلانگ لگائی اور یہ کچھ نہ بولے۔ اسی انتظام کے تحت الیکشن بھی لڑے‘ اسی کے تحت عورتوں کی سیٹوں کے لیے بھی مقابلہ کیا۔ مزید یہ کہہ دیا کہ ہم طالبان نہیں ہیں۔ جن شہداء کے خون کی بدولت انہیں اقتدار ملا ہے‘ آج انہی سے اعلانِ براءت کر رہے ہیں۔ جو کچھ مشرف نے کیا ہے‘ وہی یہ کر رہے ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ ہم طالبان نہیں‘ ہم عورتوں کو برقع اوڑھنے پر مجبور نہیں کریں گے۔ کیوں؟ اسلام میں پردہ ہے یا نہیں؟ انہیں کم از کم صوبہ سرحد میں‘ جہاں سو فیصد ان کی حکومت ہے‘ شریعت نافذ کرنی چاہیے۔ سعودی عرب میں آج بھی شرعی قوانین نافذ ہیں۔ وہاں گھر کے اندر ان کی عورتیں بالکل یورپین لباس میں ہوتی ہیں لیکن جب باہر نکلتی ہیں تو برقع لے کر نکلتی ہیں۔ بہرحال حکومت تو جو کچھ کر رہی ہے کر رہی ہے‘ لیکن ہماری دینی جماعتوں کا کردار بھی صحیح نہیں ہے۔

اب سوچنا یہ ہے کہ کرنا کیا چاہیے! اس سلسلے میں افراد کو اٹھنا پڑے گا۔ انہیں وہ کچھ کرنا ہوگا جو ساٹھ ستر سال پہلے مولانا ظفر علی خان نے کہا تھا ؎

تہذیبِ نَو کے مُنہ پہ وہ تھپڑ رسید کر
جو اِس حرام زادی کا حلیہ بگاڑ دے!

اپنی تہذیب کے دفاع میں کھڑا ہونا پڑے گا‘ لیکن جب تک خالص اسلام کے حوالے سے تحریک نہیں چلے گی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ گڈمڈ کر کے تحریک چلاؤ گے تو گڈمڈ نتیجہ نکلے گا۔ ایوب خان ہٹے گا تو یحییٰ خان آ جائے گا‘ یحییٰ خان جائے گا تو بھٹو صاحب آ جائیں گے۔ اسی طرح کے لوگ آتے رہیں گے۔ اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا ؎

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں!

یہ پوری تہذیب ہم پر ٹھونسنے کا جو معاملہ ہو رہا ہے یہ لائقِ ضبطی ہے۔ یہ دو اشعار مجھے بہت پسند ہیں: ؎

مَیں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں اُلجھ کر اکثر
تم نے اَسلاف کی عزّت کے کفن بیچ دیے
نئی تہذیب کی بے روح بہاروں کے عوض
اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیے!

اصل تہذیب تو ہماری تھی۔ مغرب کی کیا تہذیب ہے! وہاں تو تہذیب کا بیڑا غرق ہو چکا ہے۔ آج مغرب محض ٹیکنالوجی میں اپنی برتری کی بنیاد پر کھڑا ہے‘ تہذیب کی بنیاد پر نہیں۔ ان کی تہذیب تو سنڈاس بن چکی ہے۔ جس ملک کا صدر یہ کہتا ہو کہ عنقریب ہماری قوم کی اکثریت حرام زادوں پر مشتمل ہوگی وہاں تہذیب کہاں رہی! اقبال کا کہنا غلط نہیں تھا کہ ع

’’تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی!‘‘ ان کی تہذیب مر چکی ہے‘ البتہ ان کا تمدن ابھی کچھ کھڑا ہے‘ سیاسی نظام میں کچھ جان ہے اور ٹیکنالوجی کھڑی ہوئی ہے۔ ساری طاقت ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر ہے‘ جس کی اقبال نے پیشین گوئی کی تھی کہ ؎

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو اُبھارا
اللہ کو پامردیٔ مؤمن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا!

یہ درندے ہیں جن کی درندگی پہلے افغانستان میں دیکھ لی گئی‘ اب عراق میں دیکھی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ اس معرکۂ روح و بدن میں ہم عملی طور پر کام کرتے ہوئے میدان میں نکلیں۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

اِنفرادی نصب العین اور اجتماعی ہدف

انجینئر عمیر نواز *

زیرِنظر مقالہ تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع منعقدہ ۱۹ تا ۲۱ نومبر ۲۰۲۱ء بمقام مرکزی اجتماع گاہ بہاول پور میں پیش کیا گیا۔ بعدازاں فاضل مقرر نے خود ہی اسے ایک مضمون کی صورت میں مرتّب کیا' جسے قدرے ایڈیٹنگ کے بعد ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔

عالمِ اسلام کے تناظر میں بیسویں صدی عیسوی اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ ایک جانب تو اس میں مغربی استعمار سے آزادی کی قومی تحریکوں کا آغاز ہوا اور دوسری طرف حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا ''بھولا ہوا سبق'' بھی یاد آنے لگا۔ اس دور کی نابغہ روزگار شخصیات نے انفرادی حیثیت میں اور اسلامی احیائی تحاریک نے مجموعی طور پر مذہب کے محدود اور روایتی تصوّر کی بجائے دینِ اسلام کے ہمہ گیر' جامع اور انقلابی تصوّر کو خوب اُجاگر کیا۔ جوش و وَلولے اور ایثار و قربانی کے اعتبار سے تو مصر کی 'الاخوان المسلمون' مگر فکری وسعت و گہرائی کے اعتبار سے برعظیم پاک و ہند کی 'جماعت اسلامی' کو امتیاز حاصل رہا۔

دین کے وسیع اور انقلابی تصوّر کے ضمن میں اجتماعی ہدف تو نظامِ عدل وقسط کے قیام کی جدّوجُہد ہی ہے' مگر ایک فرد کی انفرادی حیثیت میں اس کا اصل نصب العین صرف اور صرف اللہ کی محبّت اور اُس کی رضا کا حصول ہے۔ اللہ کی اسی محبّت اور رضا کے مل جانے ہی کا نتیجہ اُخروی فوز و فلاح اور نجات ہے' یعنی جنّت میں داخلہ جبکہ جہنّم کی آگ اور دردناک عذاب سے چھٹکارا۔ (بحوالہ سورۂ آلِ عمران' آیت ۱۸۵)

دِقّتِ نظر سے غور کیا جائے تو متذکرہ بالا اسلامی احیائی تحاریک کے ہاں انفرادی نصب العین اور اجتماعی ہدف کے مابین نسبت و تناسب میں مجموعی اعتبار سے اونچ نیچ نظر آتی ہے۔

* مقامی امیر' تنظیم النور کالونی' راولپنڈی

لہٰذا انفرادی نصب العین یعنی اللہ ربّ العزت کی رضا و محبّت کا کتابی اور زبانی اقرار تو موجود رہا مگر دھیرے دھیرے اور غیر محسوس طریقے سے اجتماعی ہدف یعنی غلبہ و اقامتِ دین ہی اصل انفرادی نصب العین اور مطلوب و مقصود بنتا چلا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ جماعتیں رفتہ رفتہ مذہبی سے زیادہ سیاسی' بلکہ محض اسلام پسند جماعتیں اور تحاریک بنتی چلی گئیں۔ ان کے کارکنان میں غلبہ و اقامتِ دین کی جِدّوجُہد پر توجّہ کے ارتکاز کے باعث دین کا باطنی اور روحانی پہلو آہستہ آہستہ مفقود ہوتا چلا گیا (اِلّا ماشاء اللہ)۔ اجتماعی ہدف کو نصب العین بنا لینے کی وجہ سے ان میں مایوسی اور عجلت پسندی پیدا ہوئی' پھر راہِ یسیر (short cut) کی تلاش ہوئی اور بالآخر بنیادی اصولوں پر سمجھوتہ کرتے ہوئے لبرل' سیکولر حتیٰ کہ اسلام دشمن قوتوں کی حاشیہ نشین بن بیٹھیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار !

دوسری جانب مجرد انفرادیت کے تصوّر پر مبنی اور اپنے ہی مَن میں ڈوب کر سراغِ زندگی پا لینے کے جویا یعنی محبّت و معرفتِ الٰہی' عرفانِ ذات' فنافی اللہ اور وصل باللہ کی پُرکیف و مست وادی کے سالکین و عارفین اجتماعی ہدف یعنی غلبہ و اقامتِ دین کی جِدّوجُہد سے بالکلیہ بے نیاز نظر آنے لگے۔ یہ انفرادی نصب العین پر توجّہ مرکوز کرتے ہوئے اجتماعی ہدف کو نظرانداز کرنے کا نتیجہ تھا۔

دینِ اسلام کو اگر گلاب کے ایک حسین و دلکش پھول سے تشبیہہ دی جائے تو اوّل الذکر انقلابیوں نے شوخیٔ گل اور نرمیٔ برگ ہی کے ظاہر کو توجّہ میں لیا' جبکہ سالکین پھول کے باطن سے لَو لگاتے ہوئے خوشبوئے گل ہی کے دیوانے بنے رہے۔ درحقیقت دین کا یہ مسحور کن اور دلفریب پھول ایک حقیقت کُلّی (organic whole) کے طور پر قبول کرنا مطلوب تھا۔ ظاہر و باطن کی دوئی اور شریعت و طریقت کی یہ جدائی اگرچہ دورِ خلافت راشدہ کے بعد ہی ظاہر ہونا شروع ہو گئی تھی مگر کاٹ کھانے والی ملوکیت مُلْکاً جبریًا کے پنجے گاڑ لینے کے بعد تو یہ دو الگ نظام ہائے فکر کی صورت اختیار کرتی چلی گئی۔ ؎

اُڑائے کچھ ورق لالے نے' کچھ نرگس نے' کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری!

ذیل میں انفرادی نصب العین اور اجتماعی ہدف کے اسی تعلق میں افراط و تفریط کے ضمن میں چند گزارشات پیش کی جا رہی ہیں۔ قرآن حکیم کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اُخروی نتیجے

کے پس منظر میں مجموعی گفتگو فرد (individual) کے حوالے سے کی گئی ہے' جبکہ دُنیوی پہلو سے بیشتر گفتگو اجتماعیت کے نقطۂ نظر سے کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں یہ حقائق بیان کیے گئے کہ اُخروی محاسبہ فرداً فرداً ہوگا۔[1] ذائقۂ موت چکھنے اور قیامت کے بپا ہونے کے بعد جو کوئی بھی آگ سے بچا کر جنت میں داخل کر دیا گیا تو وہی فرد کامیاب رہا۔ ہنگامہ قیامت کے برپا ہونے کے وقت نفسا نفسی کا ایسا عالَم ہوگا اور ہر فرد کو اپنی ہی نجات کی ایسی فکر دامن گیر ہوگی جو اسے ہر قیمتی متاعِ دُنیوی سے بے نیاز اور ہر عزیز رشتے سے بے پروا کر دے گی۔ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر یہ چشم کشا حقیقت بیان ہوئی کہ سفرِ آخرت میں کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا' گویا وہاں تو اپنی گٹھڑی اور اپنا ہی کندھا ہوگا۔

قرآن کی رو سے محاسبۂ اُخروی بالکلیہ انفرادی حیثیت میں ہوگا' جس کا مقصود فرد کی نجات اور فوز و فلاح ہے۔ اسی نصب العین کا بلند ترین پہلو یہ ہے کہ بندے کو اللہ ربّ ذوالجلال کی ایسی محبّت' معرفت اور قرب نصیب ہو جائے کہ صرف وہی ذات مقصودِ حقیقی' مطلوبِ حقیقی اور محبوبِ حقیقی بن جائے۔ ع ''جو دَم غافل' سو دَم کافر مرشد ایہہ پڑھایا ہو!'' یعنی اُس کی یاد سے غافل گزرا ہوا ایک لمحہ بھی کفر لگے۔ مشاہدۂ حق کی ایسی سحر آفریں کیفیت اور احسان کا ایسا سرور میسّر آجائے کہ ہجر و فراق کا سوال ہی بے معنی ہو کر رہ جائے۔ ؎

آئے تھے سبھی طرح کے جلوے مرے آگے　　مَیں نے مگر اے دیدۂ حیراں نہیں دیکھا
ہر حال میں بس پیشِ نظر ہے وہی صورت　　مَیں نے کبھی روئے شبِ ہجراں نہیں دیکھا!

لامتناہی تمنّاؤں اور آرزوؤں کے جھاڑ جھنکاڑ سے دل کی دنیا کو محبوبِ حقیقی کے لیے خالی کر کے اس کی اَشد محبّت کو تمام محبتوں پر حاوی کر لیا جائے۔[2] اُسی کے حسنِ لم یزل سے لبریز ہو کر اور عشق الٰہی کی آگ میں جل کر ماسوا اللہ ہر شے خاکستر کر دی جائے۔

کُلُّ ما فی الکون وَھم او خیال　　او عُکوس فی المرایا او ظلال

''کون و مکاں میں جو کچھ بھی ہے' بس وہم یا خیال ہے۔ یا پھر آئینوں میں عکس یا سائے ہیں۔''

یہاں تک کہ اللہ کے سوا ہر شے وہم' خیال' آئینوں کے عکوس' سایہ' فریب' حادث اور ممکن محسوس ہونے لگے۔ اس واجب الوجود ہستی کے سوا کچھ اور نظر ہی نہ آئے' حتیٰ کہ مَن و تُو کا فرق مٹا کر بندہ بے خودی میں پکار اٹھے: لَاموجود اِلَّا اللہ۔

مگر بلین ڈالر سوال یہ ہے کہ اللہ کی محبّت کا یہ گوہر نایاب ملے تو ملے کیسے!

اُس رحیم و شفیق ذات کے کیا کہنے کہ اپنی محبّت و رضا کے حصول کا سلوک بھی خود اپنے کلام میں واضح کر دیا' تاکہ بندگانِ خدا محبّتِ الٰہی کے حصول کے لیے راہبانہ تصوّرِ نیکی پر مبنی خودساختہ ریاضتوں' مجاہدوں' چلّوں' غیر مسنون اَذکار و اَشغال اور بدعات کے دھکوں سے بچ سکیں۔[3] بایں ہمہ اللہ نے محبّتِ الٰہی کے دعوے کی صداقت کو اپنے محبوبِ کبریا حضرت محمد ﷺ کی ہمہ جہت اتّباع و پیروی سے مشروط کر دیا۔[4]

دوسری طرف اَز روئے قرآن اتباعِ رسول ﷺ اور عشقِ مصطفیٰ ﷺ ہی کے ہمہ گیر اور جامع تصوّر کا تقاضا ہے کہ ہماری سعی و جُہد کا اجتماعی ہدف بھی وہی بن جائے جو درحقیقت نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت بھی ہے[5] اور رسولوں کے بھیجنے اور کتابوں کے اتارے جانے کی غایت بھی' تاکہ انسانوں کے مابین ہر طرح کے ظلم' ناانصافی اور اونچ نیچ کی بیخ کنی کی جا سکے۔ انہیں استحصال' استبداد اور امتیازات پر مبنی جابرانہ اور باغیانہ نظام کے شکنجے سے نجات دلوا کر ان کے دکھوں کا مداوا کیا جا سکے تاکہ رَحمۃٌ للعالمین ﷺ کی رَحمۃٌ للعالمینی کا عالمی اور آفاقی ظہور ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ عدل و قسط کے قیام اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے حصول کے لیے جو جواں ہمت مَردانِ کار باطل کے خلاف منظّم ہو کر صف آرا ہوں' اللہ ایسے ہی لوگوں سے محبّت کرتا ہے۔[6]

مزید برآں' آخرت میں دردناک عذاب سے چھٹکارے کے انفرادی نصب العین کو ایمانِ حقیقی اور جہاد فی سبیل اللہ کے ساتھ اجتماعی ہدف کے لیے پیہم جِدّ و جُہد سے مشروط کر دیا گیا۔[7] سچے اور غیرت مند اہل اللہ بھی وہی ہیں جو اپنے دور کے باطل کے سامنے سرنگوں نہ ہوئے بلکہ اللہ کی راہ میں مصیبتوں پر ڈٹے رہے اور ربّ کے باغیوں سے آخری سانس تک برسرِ پیکار ہو کر اللہ کی محبّت کے حق دار ٹھہرے۔ اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضَہٗ بَعْضًا کے اصول کے تحت یہاں آ کر انفرادی نصب العین یعنی اللہ کی محبّت و رضا کا حصول اجتماعی ہدف یعنی غلبہ و اقامتِ دین کی مسلسل جِدّ و جُہد سے مشروط ہو گیا۔

معلوم ہوا کہ بندۂ مؤمن کا صرف ایک ہی نصب العین ہونا چاہیے' اور وہ ہے ربِّ کائنات کی محبّت و رضا کا حصول۔ یہ محبّت اتّباعِ رسول ﷺ کے بغیر ممکن نہیں اور اتباعِ رسول ﷺ یہ ہے کہ زندگی کے ہر پہلو میں نبی اکرم ﷺ کے مبارک طریقے کی پیروی کی جائے۔ پھر خود کو تکبیرِ

رَبّ کے اجتماعی ہدف کی اسی جاں گسل جدّوجُہد میں کھپایا جائے جس میں آپ ﷺ کے شب وروز صَرف ہوئے‘ کیونکہ یہی آخرت میں دردناک عذاب سے چھٹکارے کی تجارت ہے۔

تحریک رجوع الی القرآن کے پندرھویں صدی کے بلامبالغہ داعی اور مجدّد استاذی و مرشدی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اسلامی احیائی تحاریک کے ہاں نقطۂ نظر کی اس تبدیلی کی نہ صرف تشخیص کی بلکہ علاج بھی تجویز کیا۔ ۱۹۶۷ء میں اپنے ایک معرکۃ الآراء مضمون ’’اسلام کی نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اَصل کام‘‘ میں ’’تعبیر کی کوتاہی‘‘ کے عنوان سے رَقم طراز ہیں:

’’ذرا دقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تحریکوں کا مطالعۂ اسلام اسی مغربی نقطۂ نظر پر مبنی ہے جس میں روح پر مادّے اور حیاتِ اُخروی پر حیاتِ دنیوی کو فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ اسلام کے ان ماوراء الطبیعیاتی اعتقادات کا اقرار تو ان کے یہاں موجود ہے جن کے مجموعے کا نام ایمان ہے لیکن انہیں کچھ درخورِ اعتناء اور لائقِ التفات نہیں سمجھا گیا اور نگاہیں کلیۃً اس ہدایت و رہنمائی پر مرکوز ہیں جو حیاتِ دُنیوی کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام نے دی ہیں اور جن کے مجموعے کا نام ’’اسلامی نظامِ زندگی‘‘ رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اقرار تو موجود ہے لیکن ’’ایمان باللہ‘‘ کی وہ کیفیت کہ آفاق واَنفس میں تنہا وہی فاعلِ مطلق‘ مؤثرِ حقیقی اور مسبّب الاسباب ’’نظر‘‘ آنے لگے‘ بالکل مفقود ہے۔ آخرت کا اقرار تو کیا جاتا ہے لیکن اس پر ایسا ایمان کہ ’’کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ (دُنیا میں ایسے رہو‘ جیسے اَجنبی یا مسافر)‘‘ کی کیفیت پیدا ہو جائے‘ قطعاً ناپید ہے۔ رسالت کا اقرار تو ہے لیکن محبّتِ رسول ﷺ نام کو موجود نہیں‘ اور مقامِ رسالت کا تصور زیادہ ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو ڈاک کے ہرکارے اور صرف اپنی زندگی میں ملّت کے مرکز یعنی رہبر ومطاع سے زیادہ نہیں۔(۸) اور جو سُنّت کے مقام سے زیادہ آگاہ ہیں انہوں نے بھی سُنّتِ عادت اور سُنّتِ رسالت کی تقسیم سے ایسا چور دَروازہ پیدا کر لیا ہے جس سے کم اَز کم اپنی نجی زندگیوں کی حد تک زمانے کا ساتھ دینے کی آزادی برقرار رہے‘ گویا ’’ایمان‘‘ کا صرف وہ اقرار پایا جاتا ہے جو قانونی اسلام کی بنیاد ہے اور یہ کیفیت کہ ایمان انسان کا ’’حال‘‘ بن جائے نہ صرف یہ کہ موجود نہیں بلکہ اس کی کسی ضرورت واَہمیت کا احساس بھی سرے سے عنقا ہے!‘‘ (۹)

آگے چل کر اسلام کی اس نئی تعبیر کے وجود میں آنے کا سبب صفحہ ۱۵‘۱۶ پر یوں بیان کیا:

’’اسلام کی یہ نئی تعبیر براہِ راست نتیجہ ہے مغرب کے فلسفہ وفکر کے ہمہ گیر تسلّط کا جس نے نقطۂ نظر کو ملحدانہ و مادّہ پرستانہ بنا کر رکھ دیا۔ نتیجتاً روح اور اس کی حیاتِ باطنی خارج اَز بحث ہو گئی‘ اور مادّہ اور حیاتِ دُنیوی ہی سارے غور وفکر کا موضوع اور سوچ بچار کا مرکز بنے۔ چنانچہ دین و مذہب کی بھی مادّی تعبیر ہوئی اور کہنے میں تو اگرچہ آیا کہ اسلام فلاحِ انسانی کا جامع پروگرام ہے جس میں فلاحِ اُخروی اور فلاحِ دُنیوی دونوں شامل ہیں‘ لیکن نگاہیں چونکہ فی الواقع صرف حیاتِ دُنیوی پر مرکوز ہیں‘ لہٰذا آخری تجزیے میں اسلام ایک ’’سیاسی وعمرانی نظام‘‘(Politico-Social System) بن کر رہ گیا ہے۔ اور ’’الٰہیات‘‘ کی حیثیت ایک ’’پردے‘‘ سے زیادہ نہ رہی۔ چنانچہ زندگی کا اصل مقصد یہ قرار پایا کہ اس نظامِ زندگی کو عملاً رائج و نافذ کیا جائے۔ رہی خدا کی معرفت ومحبّت اور اس کے سامنے تضرع و اخبات جو عبادت کا اصل جوہر ہیں‘ تو ان کی حیثیت بالکل ثانوی واضافی ہو کر رہ گئی۔

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں فی الواقع ’مذہبی‘ سے زیادہ ’سیاسی وعمرانی‘ اور ’دینی‘ سے زیادہ ’دُنیوی‘ ہیں۔ اور آخری تجزیے میں دوسری سیاسی و معاشی تحریکوں سے صرف اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ ان کے نزدیک سرمایہ دارانہ جمہوریت یا اشتراکیت بہتر نظام ہائے حیات ہیں اور اِن کے نزدیک اسلام انسانی زندگی کے جملہ مسائل کو بہتر طور پر حل کرتا ہے۔ گویا درحقیقت مذہب کی اصل اَقدار کے احیاء کا کام تو ابھی شروع بھی نہیں ہوا۔ ؎

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے اَبھی!

یہی سبب ہے کہ یہ تحریکیں بے لنگر کے جہازوں کے مانند اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہیں اور ان کا حال اکثر وبیشتر اس مسافر کا سا ہے جسے نہ تو منزل ہی کا پتہ رہا اور نہ یہ ہی یاد رہا کہ سفر شروع کہاں سے کیا تھا۔ ؎

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور وکفن
غربت جس کو رَاس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا!‘‘

’’احیائے اسلام کی شرطِ لازم: تجدیدِ ایمان‘‘ کی شہ سرخی کے ضمن میں صفحہ ۱۷‘۱۸ پر لکھتے ہیں:

’’ایمان لامحالہ کسی ماوراء الطبیعیاتی حقائق پر یقین کا نام ہے‘ اور اس راہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ انسان ’’اَن دیکھی‘‘ حقیقتوں پر دکھائی دینے والی چیزوں سے زیادہ یقین رکھے اور سَر

کے کانوں سے سنی جانے والی باتوں سے کہیں زیادہ اعتماد اُن باتوں پر کرے جو صرف دل کے کانوں سے سنی جاسکتی ہیں۔ گویا ''ایمان بالغیب'' اس راہ کی شرطِ اوّلین ہے اور اس کے لیے فکر و نظر کا یہ انقلاب اور نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی یہ تبدیلی لازمی و لابُدی ہے کہ کائنات غیر حقیقی اور محض وَہمی و خیالی نظر آئے لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندۂ جاوید حقیقت معلوم ہو۔ کائنات کا پورا سلسلہ نہ اَز خود قائم معلوم ہو نہ کچھ لگے بندھے قوانین کے تابع چلتا نظر آئے' بلکہ ہر آن و ہر سمت ارادۂ خداوندی و مشیتِ ایزدی کی کارفرمائی محسوس و مشہود ہو جائے۔ مادّہ حقیر و بے وقعت نظر آئے لیکن روح ایک حقیقتِ کُبریٰ معلوم ہو۔ انسان کا اطلاق اُس کے جسدِ حیوانی پر نہ ہو بلکہ اُس روحِ رَبانی پر کیا جائے جس کی بدولت وہ ''مسجودِ ملائک'' ہوا۔[10] حیاتِ دُنیوی فانی و ناپائیدار ہی نہیں بالکل غیر حقیقی و بے وقعت معلوم ہو اور حیاتِ اُخروی اَبدی و سرمدی اور حقیقی و واقعی نظر آنے لگے! اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے مقابلے میں دنیا و مافیہا کی وقعت حدیثِ نبوی ﷺ کے مطابق مچھر کے پَر سے زیادہ محسوس نہ ہو! یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ جب تک اُمّت کے ایک قابلِ ذکر اور مؤثر حصے میں نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی واقعتاً پیدا نہ ہو جائے ''احیائے اسلام'' کی آرزو ہر گز شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے گی۔'' (طبع ۲۲: ستمبر ۲۰۲۱ء)

محولہ بالا نباضی اور تشخیص کے بعد اس ''تعبیر کی کوتاہی'' کا ازالہ اسی سال یعنی ستمبر ۱۹۶۷ء ہی میں ''قراردادِ تاسیس'' کی صورت میں بڑے غور و خوض کے بعد ضبطِ تحریر میں آیا۔ اس کے ذریعے احیائی تحریکوں کے فکر و نظر کے متذکرہ بالا نقص کی تلافی کرتے ہوئے انفرادی نصب العین اور اجتماعی ہدف کو توازن کے ساتھ اپنے اپنے محل و مقام پر رکھا گیا۔ اس قرارداد کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''آج ہم اللہ کا نام لے کر ایک ایسی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری مدد و معاون ہو — ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اُسی کی اَخلاقی و روحانی تکمیل اور فلاح و نجات' دین کا اصل موضوع ہے' اور پیش نظر اجتماعیت اصلاً اسی لیے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے.....''

انفرادی نصب العین اور غلبۂ دین کے اجتماعی ہدف کے مابین عدم توازن کے اس رویے کو قراردادِ تاسیس کی ''توضیحات'' صفحہ ۲۹ میں وضاحت کرتے ہوئے بانی محترمؒ لکھتے ہیں:

> ''..... اس تصریح کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ ماضی میں مسلمانوں کو ان کی یہ

ذمہ داری تو بالکل ٹھیک یاد کرائی گئی کہ جس دین کے وہ مدعی ہیں اسے دنیا میں عملاً قائم کرنے کی سعی و جُہد بھی ان پر فرض ہے اور یہ کہ دین محض ذاتی عقائد اور کچھ مراسمِ عبودیت یعنی انسان اور رَبّ کے مابین پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اپنے احاطے میں لینا چاہتا ہے' لیکن ان اُمور پر اس قدر زور دیا گیا کہ بندے اور رَبّ کے مابین تعلق کی اہمیت اور اَفراد کی اپنی علمی' اَخلاقی اور روحانی ترقی نظر انداز ہوتی چلی گئی۔ آئندہ جو کام پیشِ نظر ہے اُس کے اُصول و مبادی میں یہ نکتہ بہت زیادہ قابلِ لحاظ رہے گا کہ ایک مسلمان کا اَصل نصب العین صرف نجاتِ اُخروی اور رضائے الٰہی کا حصول ہے اور اس کے لیے اسے اصل زور اپنی سیرت کے تطہیر و تزکیے اور اپنی شخصیت کی تعمیر و تکمیل پر دینا ہوگا' جس سے تعلق مع اللہ اور محبّتِ خدا اور رسول ﷺ میں اضافہ ہوتا رہے اور اس میں زیادہ سے زیادہ اخلاص پیدا ہوتا چلا جائے۔ دین کی تائید و نصرت اور شہادت و اقامت یقیناً فرائضِ دینی میں سے ہیں لیکن ان کے لیے کوئی ایسی اجتماعی جِدّ و جُہد ہرگز جائز نہیں ہے جو اَفراد کو ان کے اَصل نصب العین سے غافل کر کے انہیں محض ایک دنیوی انقلاب کے کارکن بنا کے رَکھ دے۔''

اس عدم توازن کے نتائج کے بارے میں صفحہ ۳۰ پر لکھتے ہیں:

> ''..... یہ صورتِ حال کہ جلسوں کے انعقاد کے ضمن میں تو پابندی بھی ملحوظ رہے اور جوش و خروش کا بھی مظاہرہ کیا جائے لیکن نماز باجماعت کی پابندی گراں محسوس ہو اور نوافل سرے سے خارج اَز بحث ہو جائیں' دین کی نصرت و حمایت کا جذبہ تو ترقی کرتا چلا جائے لیکن تزکیۂ باطن کی طرف کوئی توجّہ نہ دی جائے' یا سُنّتِ نبوی ﷺ کی حجیت و اَہمیت پر دَلائل تو اَز بر ہوں لیکن خود اَپنی زندگی میں اتّباعِ نبوی ﷺ کی جھلک نظر نہ آئے' نہ صرف یہ کہ اَفراد کے حق میں سمِ قاتل ہے بلکہ خود اجتماعیت کے لیے بھی سخت مضر اور مہلک ہے۔''

واقعہ یہ ہے کہ امام الہند شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رحمہ اللہ کے منہج پر گامزن ہو کر بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار اَحمدؒ نے مروّجہ تصوّف[11] کی بجائے سلوکِ محمدی ﷺ یعنی احسانِ اسلام پر بھرپور زور دیا اور دین کے حسین پھول کے ظاہر و باطن کے ان دو لازمی و لابُدی اجزاء (integral components) کو یکجا کرتے ہوئے قرآن کے ذریعے اسلام کی انقلابی فکر پیش کی۔ ایک طرف تو دنیا کی منجدھار سے ہٹ کر یک رخی انفرادیت پر مبنی مروّجہ تصوف اور روایتی مذہبی و فقہی ظاہریت پر تنقید کی تو دوسری جانب خودی سے غافل اور عرفان ذات سے گریزاں

نری انقلابیت کا سقم واضح کیا۔ لہٰذا اس فکر میں فرد کے انفرادی نصب العین کو عزم اور اجتماعی ہدف پر فائق رکھتے ہوئے رُفقاء کی تربیت پر بھرپور زور دیا۔ اس فکر کے چھ نکات درج ذیل ہیں: (یہ نکات ایک لفظ ''**نعم جدت**'' کے ذریعے بآسانی یاد رکھے جا سکتے ہیں۔)

(۱) **ن** ---نصب العین --- محبّت و رضائے الٰہی کا حصول (جس کا نتیجہ اُخروی نجات اور فوز و فلاح یعنی جہنم سے چھٹکارا اور جنت میں داخلہ ہے)

(۲) **ع** ---عزم --- غلبۂ دین' نظامِ خلافت کا قیام' رَب کی دَھرتی پر رَب کا نظام

(۳) **م** ---منہج --- منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ سے ماخوذ و مستنبط

(۴) **ج** ---جہاد --- سرکش نفس' شیطان کی صلبی و معنوی ذریت' بگڑے ہوئے معاشرے اور طاغوتی نظام کے خلاف

(۵) **د** ---دعوت --- الہدیٰ (دَعوت رجوع اِلی القرآن)

(۶) **ت** --- تنظیم --- تنظیمی اَساس' شخصی بیعت سمع و طاعت فی المعروف

حاصلِ کلام یہ ہے کہ آج غلبہ و اقامتِ دین کے لیے ناگزیر ضرورت ہے کہ ان دو الگ نظام ہائے فکر (جو بظاہر ایک دوسرے کے ضد ہیں' حقیقت میں ایک ہیں) کی تجمیع و تطبیق (integration) کرتے ہوئے ظاہر و باطن سے آراستہ و پیراستہ جامع شخصیات نکھارنے اور پروان چڑھانے کی کوشش کی جائے۔ گویا کہ صوفی و مجاہد' عارف و عالم' داعی و واعظ' مبلّغ و انقلابی ایک ہی شخصیت میں منعکس نظر آتے ہوں' اور دنیا ان لوگوں کو دیکھ کر آج بھی پکار اٹھے کہ: هم رهبان بالليل وفرسان بالنهار۔ یہ اٹل حقیقت ہے کہ ایسے مَردانِ کار جو محبّت و معرفتِ الٰہی کی مَے سے مخمور ہو کر اسلام کے انقلابی فکر کے حامل ہوں' صرف قرآن ہی کے ذریعے پیدا ہو سکتے ہیں۔ (۱۲)

حواشی

(۱) ﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۝۹۵﴾ (مریم)

(۲) ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

(۳) ﴿وَرَهْبَانِيَّةِ ِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا

حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ﴾ (الحدید:۲۷)

(۴) ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۱ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۲﴾ (اٰلِ عمرٰن)

(۵) ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۹﴾ (الصف)

(۶) ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾ (الصف)

(۷) ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۱۰ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۱ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۲ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۳﴾ (الصف)

(۸) اِس مکتب کی زوردار نمائندگی کا شرف ہمارے یہاں غلام احمد پرویز کو حاصل ہے۔ یہاں اِس مکتبِ فکر کے حوالے سے صرف یہ وضاحت مقصود ہے کہ یہ بھی تعبیر کی اصلاً اسی غلطی کی اگلی منزل ہے۔

(۹) اِسلام کی نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اَصل کام' ص ۱۳-۱۴ از ڈاکٹر اِسرار اَحمدؒ (طبع ستمبر ۲۰۲۱ء)

(۱۰) آیہ قرآنی: ﴿فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝۲۹﴾ (الحجر) ''جب مَیں اُسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی رُوح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔''

(۱۱) واضح رہے کہ بانیٔ محترمؒ نے مقاصدِ تصوّف کی تو بھرپُور تائید' حمایت بلکہ وکالت کی مگر اِن مقاصد کے حصول کے ذرائع کے لیے سلوکِ محمدی ﷺ پر زور دِیا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ''مروّجہ تصوّف یا سلوکِ محمدی ﷺ یعنی احسانِ اسلام'' اور ویڈیو بعنوان: 'حقیقتِ تصوّف۔

(۱۲) تنظیم اِسلامی کے نظامِ تربیت و نگرانی میں احسانِ اِسلام مسودہ ہو یا ملتزم و ذِمہ داران رِپورٹس اور طلبِ اصلاح خطوط' تربیتی نصاب ہو یا تربیتی کورسز و تربیتی اِجتماعات' یہ سب درحقیقت انفرادی نصب العین (یعنی محبت و رضائے الٰہی) اور اجتماعی ہدف (یعنی غلبہ و اِقامتِ دِین کی جِدّ و جُہد) کے مابین توازن قائم کرنے کی کوششیں ہی ہیں۔

❀❀❀

مطالعہ اچھی تحریر کے لیے غذا ہے!

راحیل گوہر

کتابوں کا مطالعہ مسلمانوں کی ایک عظیم روایت رہا ہے۔ عہدِ وسطیٰ میں ہر شخص کتابوں کا دلدادہ تھا۔ کتابوں پر بحث ومباحثے' تنقید وتبصرے ہوتے تھے۔ جدھر جاؤ' جس محفل میں بھی جا بیٹھو' کتابوں کا تذکرہ ہی زبان زدِ خاص و عام ہوا کرتا تھا۔ مسلمان فلسفی و دانشور کتابوں کی تلاش میں صحراؤں کی خاک چھانتے پھرتے۔ عرب ممالک میں کتب خانے اور کتابوں کی بے شمار دکانیں تھیں۔ قاہرہ میں قائم مکتبۂ فاطمین میں تقریباً بیس لاکھ کتابیں تھیں۔ بغداد کا بیت الحکمت کتب خانہ نہیں بلکہ ایک عظیم یونیورسٹی تھا جہاں محقّق' عالم' فلسفی سب جمع ہوتے۔ روز نئی کتابیں لکھی اور پڑھی جاتی تھیں۔ افسوس کہ اس قابلِ رشک ماضی کے باوجود آج مسلم معاشرے خصوصاً پاکستان میں کتابیں غائب ہوتی جارہی ہیں۔ مَردوں اور عورتوں میں مطالعہ کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔

مطالعہ بھی ایک فن ہے' بالخصوص دورِ جدید میں جب انسانی زندگی بہت مصروف اور تیز رفتار ہوچکی ہے' اب ہر شعبۂ زندگی کے بارے میں ضروری اور بنیادی معلومات حاصل کرنا لازمی ہے اور گہرے مطالعہ کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ خاص طور سے وہ لوگ جنہیں لکھنے کا شوق ہے' ان کے لیے تو مطالعہ ایسا ہی ہے جیسے زندہ رہنے کے لیے غذا حاصل کرنا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی' اردو ادب کا ایک بڑا نام ہے' کہتے تھے کہ ''وہ لوگ جو صرف لکھنے کا عمل کرتے ہیں اور مطالعہ پر توجّہ نہیں دیتے وہ اپنی تحریروں میں خود کو دہرانے لگتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے گہرائی اور تہ داری غائب ہوجاتی ہے۔ مطالعہ ہی وہ عمل ہے جو ذہن کو کشادگی جبکہ شعور کو پختگی اور جامعیت عطا کرتا ہے۔'' حقیقت یہ ہے کہ مطالعہ ہی انسان کے علم کو جلا بخشتا ہے۔

مطالعہ انسان کی شخصیت کو ایسے نکھار دیتا ہے جیسے کسی سیاہ تانبے کے برتن کو قلعی کردی

Email:raheelgoher5@gmail.com

جائے' یا کسی اندھیری جگہ پر جلتے ہوئے چراغ کی جگہ ہائی پاور کا بلب لگا دیا جائے جس سے اردگرد کا پورا ماحول روشن ہوجاتا ہے' یا پھر کسی گھٹن زدہ کمرے کے دروازے کھول دیے جائیں۔ مطالعہ ذہن کے افق کو وسیع کرتا ہے۔ اچھی کتاب کا مطالعہ انسان کے علم میں اضافہ کرتا ہے۔ مطالعہ پیٹرول کی طرح ہوتا ہے' مثلاً نئی گاڑی کی بھی اس وقت تک کوئی اہمیت اور وقعت نہیں ہوتی جب تک اس میں پیٹرول نہ ڈالا جائے۔ اسی طرح پی ایچ ڈی کی ڈگری رکھنے والے کو بھی مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے جس سے اس کے علم وفضل میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

دورِ جدید کا المیہ یہ ہے کہ انٹرنیٹ کے پھیلاؤ نے طالب علم کا کتاب سے رشتہ تقریباً ختم ہی کردیا ہے۔ صرف ایک انگلی کے ''ٹچ'' پر پوری دنیا اسکرین پر نمودار ہوجاتی ہے۔ اس سہولت نے طلبہ کے لیے ہر چیز کو سہل الحصول بنا دیا ہے۔ حصولِ علم کے لیے جو محنت' جِدّ وجُہد اور جاں فشانی مطلوب ہوتی تھی اس سے جان چھڑالی گئی ہے۔ کتاب سے علم حاصل کرنے میں یہ ہوتا تھا کہ چاروناچار پوری کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کرلیا جاتا تھا۔ چھپائی کرنے اور نقل کرکے سوال نامہ حل کرنے والے کو بھی کتاب تو دیکھنی ہی پڑتی تھی' مگر انٹرنیٹ اور موبائل نے انہیں یہ سہولت فراہم کردی ہے کہ اپنی ضرورت کے مواد موبائل میں دیکھ کر پرچہ امتحان دے دیتے ہیں' اس کے علاوہ کتاب میں آگے کیا ہے اور پیچھے کون سا مضمون ہے' اس کا انہیں کوئی علم نہیں ہوتا۔ کتاب کی اس درجہ ناقدری نے اس کی وہ وقعت ہی ختم کردی ہے جس سے کبھی اکابرین دن رات استفادہ کیا کرتے تھے اور ان کو اپنے سینے سے لگا کر رکھتے تھے۔

اردو کے معروف ادیب مختار مسعود نے اپنی کتاب ''آوازِ دوست'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ بیسویں صدی کی ابتدائی چار دہائیاں کتاب پڑھنے اور کتاب لکھنے کا زمانہ تھا جس میں بہت اچھی کتابیں لکھی گئیں اور نامور ادیب وشاعر اور دانشور پیدا ہوئے' لیکن ۱۹۵۰ء کے بعد سے ایسا لگتا ہے کہ پاکستان کی مائیں شاید تاجر اور سیاست دان ہی پیدا کررہی ہیں۔ خاتون ادیب شاہین رحمٰن کہتی ہیں کہ ادب کو علم کا زیور کہا جاتا ہے اور علم انسانی ذہنوں کی آبیاری کرتا ہے' تہذیبوں کو جنم دیتا ہے' معاشروں کو پروان چڑھاتا ہے اور ایسا کرنے میں کتاب بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ جب تک کوئی معاشرہ کتاب سے منسلک رہتا ہے وہاں ترقی کا سفر جاری رہتا ہے' لیکن بدقسمتی سے پاکستانی معاشرہ گزشتہ دو دہائیوں سے کتاب بینی سے دور ہوتا جارہا ہے۔

یہ درست ہے کہ انٹرنیٹ نے تیز ترین معلومات فراہم کرنے کی ایک نئی دنیا سے متعارف کرایا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ علمی ذخائر جو پہلے کبھی لائبریریوں میں ہوا کرتے تھے‘ اب سرچ انجن کے ذریعے سے ان تک رسائی بہت آسانی سے ہوجاتی ہے‘ لیکن اس طرزِ عمل پر پوری طرح یقین بھی نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ ملک کے معروف سفرنامہ نگار مستنصر حسین تارڑ اس سے متفق نہیں ہیں۔ ان کے مطابق یورپ میں کمپیوٹر ہم سے پچاس سال پہلے متعارف ہوگیا تھا لیکن اس کے باوجود وہاں آج بھی کتاب پڑھنے کا رجحان اسی طرح موجود ہے۔

ہماری تہذیب میں ایک وقت وہ بھی تھا کہ کسی پڑھے لکھے مسلمان کا گھر کتب خانے کے بغیر نامکمل سمجھا جاتا تھا۔ کسی گھر میں ہزاروں‘ کسی میں سینکڑوں اور کسی گھر میں درجنوں کتابیں ہوتی تھیں۔ مگر اب ہمارا حال یہ ہے کہ کروڑوں روپے کے گھر بناتے ہیں‘ اس میں ایک ایک‘ دو دو اور کہیں چار چار گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں‘ ہر آسائش موجود ہوتی ہے‘ مگر نہیں ہوتی تو لائبریری نہیں ہوتی۔ کتاب سے لاتعلقی کا عالَم یہ ہے کہ ہم پانچ ہزار کا جوتا خریدتے ہیں اور اسے سستا سمجھتے ہیں لیکن دو سو روپے کی کتاب خریدتے ہیں اور اسے مہنگا کہتے ہیں۔

مطالعہ کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس سے زبان آشنائی پیدا ہوتی ہے۔ انسان زبان کے مختلف اسالیب کے بارے میں سیکھتا ہے۔ چیزوں کو دیکھنے کے perspective میں تبدیلی آتی ہے۔ بہتر انسان بننے میں ادبی مطالعہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے بغیر انسان کی شخصیت ادھورے پن کا شکار ہوجاتی ہے۔ ادب العالیہ آدمی کو باطنی طور پر rich کرتا ہے۔ اس کے اندر cultural behaviour پیدا ہوتا ہے اور شائستگی آتی ہے۔ نتیجتاً وہ ایک بہتر انسان بنتا ہے۔ معاشرے میں آج جتنی بے چینی اور سفاکی نظر آتی ہے اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ ادب کا مطالعہ نہیں کرتے۔ معروف شاعر اور فلسفے کے استاد جناب احمد جاوید کہتے ہیں:

> ’’میری نظر میں وہ انسان نہیں جس کو لفظ کا علم نہیں‘ لفظ جس پر اثر نہیں کرتا‘ لفظ جسے اپنی طرف نہیں کھینچتا۔ یہ ہماری فطری و مذہبی ضرورت بھی ہے‘ روحانی ضرورت بھی ہے اور جمالیاتی ضرورت بھی۔ مطالعہ تسلسلِ فکر میں دونوں طرح کی تبدیلیاں پیدا کرسکتا ہے‘ ایک یہ کہ اُس کی تکمیل کرتا ہے اور تکمیل کا عمل بعض اجزاء کو چھوڑنے اور بعض اجزاء کو اختیار کرنے سے ہوتا ہے‘ اور یہ تمیز مطالعہ ہی سکھاتا ہے۔ احمد جاوید یہ بھی کہتے ہیں کہ کوئی بھی علم حاصل کرنا ہے تو اس کے لیے کتاب ڈھونڈنے سے پہلے استاد ڈھونڈنا

چاہیے ورنہ آپ ہمیشہ چند مستقل غلط فہمیوں میں مبتلا رہیں گے۔‘‘

اصول وضوابط‘ طبیعت میں ٹھہراؤ‘ علم کی پیاس‘ اساتذہ کو پڑھنے کا ذوق اور مستقل مزاجی انسان کو باعمل اور باشعور بناتی اور اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرتی ہے۔ اپنے ہدف کی طرف جب قدم بڑھائے جاتے ہیں تو فاصلے قدموں کی دھول بن جاتے ہیں‘ راہیں ہموار ہوجاتی ہیں اور منزل کی حوصلہ افزا روشنی صبح کے اس ستارے کی مانند ہوجاتی ہے جو خاورِ مشرق کی کرنیں بکھرنے تک چاند کے پہلو نشیں ہی رہتا ہے۔ مطالعہ کی افادیت سے فیض یاب ہونے کے لیے بھی یہی سب کچھ درکار ہوتا ہے۔ مضبوط قوتِ ارادی انسان کے عمل میں اس کی سیرت و کردار کا اظہار ہے۔

انسان کے مستحکم ارادوں کے سامنے پتھر بھی موم ہوجاتے ہیں۔ ایسا کون سا پہاڑ ہے جس پر انسان چڑھ نہیں سکتا‘ ایسا کون سا صحرا ہے جسے وہ عبور نہیں کرسکتا اور ایسا کون سا سمندر ہے جس کی گہرائیوں کی انسان خبر نہیں لایا۔ صرف ہمت اور پختہ ارادوں کی ضرورت ہے‘ پھر قدرت بھی انسان کی مدد کرتی ہے۔ معیاری ادب اور آفاقی علوم کا گہرا‘ فکر انگیز اور نتیجہ خیز مطالعہ ان تمام راستوں کی سختیوں کو موم کردیتا ہے۔ شعلہ بیان مقرر شورش کاشمیری کا قول ہے کہ اچھا مقرر اور اچھا ادیب بننے کے لیے دو چیزیں بہت ضروری ہیں: ایک صبح کی واک اور دوسرے صبح کا اخبار! بات پھر مطالعہ پر ہی آگئی۔ مطالعہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ معروف فلسفی اور طبیب ابن رشد اپنی ۷۵ سالہ زندگی میں ہر روز بلاناغہ ۷۰ صفحات پڑھ لیا کرتے تھے۔ اپنی پوری زندگی میں انہوں نے صرف دو راتیں بغیر مطالعہ کے گزاریں۔ ایک رات جب ان کے والد کا انتقال ہوا اور دوسری رات ان کی شادی کی رات تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ((مَنْ سَلَکَ طَرِیْقًا یَلْتَمِسُ فِیْهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ بِهٖ طَرِیْقًا اِلَی الْجَنَّةِ)) (رواہ مسلم)
>
> ’’جو علم (دین) کی تلاش کے لیے کسی راستے پر چلے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنّت کا راستہ آسان فرمادیتے ہیں۔‘‘

حصولِ علم کے لیے تین چیزوں کا ہونا لازمی ہے: استاذ‘ کتاب اور طالب علم کا اپنا مطالعہ۔ علم کوئی بھی ہو اس کی تفہیم کے لیے کسی استاذ کا ہونا بنیادی ضرورت ہے‘ اور کتاب کے ذریعہ جو علم حاصل ہوتا ہے اس میں گہرائی‘ پختگی اور فہم و فراست کے لیے مزید مطالعہ اصل تغذیہ ہے۔

ویسے تو ہر شخص اپنے طریقے اور سہولت سے مطالعہ کرتا ہے‘ تاہم اگر تصنیف و تالیف کے اساتذہ کے بتائے ہوئے کچھ خاص اصول کے مطابق مطالعہ کیا جائے تو نتیجہ بہتر ہوسکتا ہے۔ وہ

رہنما اصول یہ ہیں:

(۱) مطالعہ کے لیے پہلی اور لازمی شرط داخلی اور خارجی پُرسکون ماحول ہے۔ ان کے بغیر انسان کسی چیز کے فہم و ادراک کے لیے یکسوئی اور ارتکازِ توجہ حاصل نہیں کرسکتا۔ خارجی سکون سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص جس جگہ بیٹھ کر مطالعہ کر رہا ہو اس کے ماحول میں کوئی شور وغل یا غیر معمولی حالات نہ ہوں جو بار بار اس کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرلیں اور اس طرح اس کی یکسوئی میں خلل اندازی ہو۔ علاوہ ازیں کم یا زیادہ تیز روشنی میں بیٹھ کر مطالعہ کرنا بینائی پر اثر ڈالتا ہے۔ نیز کتاب کو آنکھوں سے بہت قریب یا بہت دور رکھنا بھی درست نہیں۔ کتاب اور اپنی آنکھوں کے درمیان ایک فٹ کا فاصلہ رکھنا لازمی ہے۔ لیٹ کر مطالعہ کرنا بھی بینائی کے لیے نقصان دہ ہے۔

داخلی سکون سے مراد یہ ہے کہ انسان مطالعہ کے وقت ہر قسم کے تفکّرات اور پریشانیوں سے بالکل خالی الذہن ہوکر بیٹھے اور خارج کی تمام چیزوں سے توجہ ہٹا کر اسے مطالعہ کی طرف مرکوز رکھے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو اس کی توجہ بار بار منتشر ہوگی اور اس کا ذہن اپنے مقصد کے حصول سے قاصر رہے گا۔

(۲) طالب علم جس چیز کا مطالعہ کر رہا ہو اس کے مفید اور کارآمد ہونے کا پختہ یقین اس کے دل میں موجود ہو۔ کہیں حفیظ جالندھری والا معاملہ نہ ہو کہ:

ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں، توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے!

یقین کی کیفیت نفسِ مضمون میں طالب علم کی دلچسپی بڑھا دے گی اور اس کی طبیعت اکتائے گی نہیں۔ اگر اس چیز کا لحاظ نہ رکھا جائے تو لازماً طبیعت بوجھ محسوس کرے گی، جس سے ایک تو وہ مطالعہ سے جلد اُکتا جائے گا اور دوسرے جو کچھ اس نے مطالعہ کیا ہے وہ پوری طرح ذہن میں محفوظ نہیں ہوسکے گا۔

(۳) مطالعہ کے لیے ایک متعین لائحہ عمل ہونا چاہیے۔ یہ ایک فطری اصول ہے کہ جو کام کسی خاص نظم وضبط کے ساتھ کیا جائے وہ ہمیشہ اس کام کی نسبت زیادہ نتیجہ خیز ہوگا جو بے ترتیبی کے ساتھ کیا جائے۔ اس کے لیے سب سے اوّلین چیز پابندیٔ وقت اور باقاعدگی ہوتی ہے۔ اگر

پابندیٔ وقت کے ساتھ تھوڑا سا بھی مطالعہ کیا جائے تو اس کا فائدہ مستقل ہوتا ہے اور وہ انسان کے ذہن پر دیر پا نقوش چھوڑتا ہے۔ ایک حدیث مبارکہ میں بھی اسی طرح کے الفاظ آئے ہیں۔ رسولِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی أَدْوَمُھَا وَاِنْ قَلَّ)) (رواہ مسلم)

''اللہ تعالیٰ کی طرف سب سے محبوب عمل وہ ہے جو ہمیشہ ہو اگرچہ تھوڑا ہو۔''

(۴) مطالعہ کے لیے طبیعت کو ایک خاص حد سے زیادہ مجبور نہیں کرنا چاہیے بلکہ جب تک ذہن سہولت کے ساتھ مطالعہ میں یکسو رہے اس وقت تک ہی مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس کے بعد کچھ وقفہ کر کے خود کو کسی اور کام میں لگا دینا چاہیے جو اس کام کی نسبت زیادہ خوشگوار ہو۔ اس کا تعلق طالب علم کی اپنی افتادِ طبع اور اس کے مزاج سے ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آدمی کو ایک نشست میں کتنی دیر مطالعہ کرنا چاہیے تو یہ لوگوں کی اپنی اپنی استعدادِ مطالعہ پر منحصر ہے۔ کچھ لوگ کم مطالعہ کر کے زیادہ اخذ کر لیتے ہیں جبکہ بعض افراد بہت زیادہ مطالعہ کر کے بھی کم ہی استفادہ کر پاتے ہیں۔ تاہم ایک اوسط درجے کی ذہانت کے آدمی کے لیے دو سے چار گھنٹے کا باقاعدگی سے اور ٹھوس انداز میں مطالعہ مفید رہے گا۔

(۵) مطالعہ کے دوران طالب علم مختصر اشارات (notes) بھی تیار کرتا جائے، یعنی نفسِ مضمون کو اپنے الفاظ میں قلم بند کرنے کی عادت ڈالے۔ اس کے دو فائدے ہوں گے:

(ا) ہر مضمون یا کتاب کا جوہر اپنے الفاظ میں محفوظ ہو جائے گا اور طالب علم کا ذہن غیر ضروری تفصیلات اور غیر متعلقہ چیزوں کو یاد رکھنے کے بوجھ سے آزاد ہو جائے گا۔ نیز طالب علم، جس وقت چاہے اپنی مطالعہ شدہ چیزوں کا نفس مضمون ان اشارات کی مدد سے اپنے ذہن میں تازہ کر لے گا، دوبارہ اصل کتاب کی طرف رجوع نہیں کرنا پڑے گا۔ یوں اظہارِ بیان کے لیے اس کو آسان اسلوب پر قدرت بھی حاصل ہو جائے گی۔

(ب) طالب علم کا ذہن اپنے کام کی چیزوں کو اخذ کرنے اور غیر ضروری چیزوں کو نظر انداز کرنے میں خاصا مستعد اور مشاق ہو جائے گا۔ اس طرح وہ اپنے اندر کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا کر لے گا اور رٹا لگانے کی بری عادت سے محفوظ رہے گا۔

ایک اچھا لکھنے والا‘ معیاری تحریروں اور کتابوں کے مطالعے سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔ صاحبِ طرز ادیبوں اور صاف ستھری‘ خوب صورت نثر لکھنے والوں کی کتابیں مسلسل زیر مطالعہ رکھیے‘ جیسے الطاف حسین حالی‘ شبلی نعمانی‘ پریم چند‘ خواجہ حسن نظامی‘ شاہد احمد دہلوی‘ سید ابوالاعلیٰ مودودی‘ فضل احمد کریم فضلی‘ نعیم صدیقی‘ جیلانی بی اے‘ مختار مسعود اور رضا علی عابدی وغیرہ۔ (یہ مکمل فہرست نہیں ہے) انہیں مطالعہ کرتے ہوئے غور کیجیے کہ زبان کیسی با محاورہ ہے! الفاظ و تراکیب کا استعمال کیسا ہے؟ جملوں کی ساخت کیسی ہے؟ تشبیہ و استعارہ اور صنائع و بدائع کی صورت کیا ہے؟ آپ کسی سے متاثر ہو کر اس کی نقل نہ کیجیے‘ کیوں کہ ایک صاحب اسلوب ادیب کی تقلید آسان نہیں ہوتی۔ آپ معیاری تحریروں کا جس قدر مطالعہ کریں گے‘ غیر شعوری طور پر آپ کی تحریر بھی بہتر ہوتی چلی جائے گی۔

مطالعہ انسانی شخصیت کی بالیدگی کا ایک لازمی جزو ہے۔ جو چیزیں دنیا کمانے اور اپنے مادی وجود کی نشوونما کے لیے ضروری ہیں ان کے بارے میں دُنیا کا ہر انسان ساری زندگی جاننے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس میدان میں بتدریج ترقی حاصل کرتا ہے۔ اس دنیا میں بسنے والوں کی اکثریت کا یہی معمول ہے۔ اس میں کوئی قباحت بھی نہیں‘ کیونکہ زندہ رہنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے۔ ہم کائنات کی ہر چیز سے فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔ رنگ و بو کی اس دنیا میں ہم قدرت کی عطا کی ہوئی ہر نعمت سے اپنے مقام اور اپنی استطاعت کے مطابق اپنے دامنِ طلب کو بھرتے رہتے ہیں۔ مگر ایسے کتنے لوگ ہیں جو اپنے اردگرد پھیلی رنگ و نور کی اس کائنات کے مصور اور خالق و مالک کی اس صناعی اور اس کی عطا پر غور و فکر کرتے اور اس کی معرفت حاصل کرنے کی جستجو میں کوشاں رہتے ہیں؟ جبکہ خود خالق کائنات نے بھی اپنی ان نشانیوں پر غور فکر کرنے پر زور دیا ہے اور اس ہدایت پر عمل نہ کرنے والوں کی عقل پر سوالیہ نشان لگایا ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ

وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾﴾ (البقرہ)

”بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں‘ اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں‘ اور کشتیوں (اور جہازوں) میں جو دریا (اور سمندر) میں لوگوں کے فائدے کے لیے رواں ہیں‘ اور مینہ میں جس کو اللہ آسمان سے برساتا اور اس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ (یعنی خشک ہونے کے بعد سرسبز) کر دیتا ہے‘ اور زمین پر ہر قسم جانور پھیلانے میں‘ اور ہواؤں کے چلانے میں‘ اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں‘ عقل مندوں کے لیے (اللہ کی قدرت کی) نشانیاں ہیں۔“

گویا جس انسان کے اندر غور و فکر اور مشاہدے کی صلاحیت ہوگی وہی قدرت کی چہار سو پھیلی ان نشانیوں اور مظاہر فطرت کو سمجھ سکے گا‘ اور اس کا یہ مطالعہ ہی اسے اپنے ربّ سے قریب کرنے کا باعث بنے گا۔ صحیح مطالعہ ہی تو بتاتا ہے کہ انسان کے اندر فطرت کے مظاہر کو جذب (observe) کرنے کا کتنا شاکلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے کی رہنمائی کے لیے خود بے شمار مواقع مہیّا کرتا ہے کہ اُسے اپنی ذات اور اپنی حیات بے مثال کا شعور حاصل ہو سکے‘ کیونکہ اس وسیع و عریض کائنات میں بکھری ہوئی نشانیاں ہی تو اللہ کی معرفت تک بندے کو پہنچاتی ہیں۔ ارشادِ ربّانی ہے:

﴿سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ اَوَلَمْ یَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ﴿۵۳﴾﴾ (فصلت)

”ہم عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔ کیا تم کو یہ کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے خبردار ہے!“

اس آیۂ مبارکہ کی روشنی میں انسان اپنے اس مادی وجود پر ہی غور و فکر کر لے تو اس کی آنکھوں کے کئی پردے اٹھ جائیں گے۔ اگر اس کا ضمیر زندہ اور اس کی اخلاقی حِس میں کوئی حرارتِ ایمان موجود ہے تو اس کا سر اپنے معبود کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جائے گا۔ جو لوگ اللہ کی ان نشانیوں کا ادراک نہیں کر پاتے اور فنا ہو جانے والے اپنے مادی وجود ہی کی سیوا کرتے رہتے ہیں وہ اللہ کی نظر میں کیا ہیں‘ اس کا اظہار اس طرح سے ہوا ہے:

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ

هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ (الاعراف)

''ان کے دل تو ہیں لیکن یہ ان سے سمجھتے نہیں' اور ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں' اور ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ (بالکل) چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں' اور یہی لوگ وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

انسان اور جانور میں نطق' شعور اور سماعت و بصارت کا فرق ہے' اور مطالعہ کے لیے انہی استعدادات کی ضرورت ہوتی ہے۔ گویا انسان اصل میں وہ ہے جس کو مطالعہ کی قدرت حاصل ہے اور جو مظاہرِ فطرت کا مطالعہ نہیں کرتا یا اس کی کوشش نہیں کرتا اس کا اللہ کی نظر میں کیا مقام ہے' وہ اس آیت سے صاف ظاہر ہے۔ اب ہر انسان اس کی روشنی میں اپنا جائزہ لے سکتا ہے کہ وہ اس ناپائیدار دُنیا میں کس حیثیت سے زندگی گزار رہا ہے۔

انسان جب دنیاوی علوم کے مطالعہ میں زندگی کا ایک بڑا عرصہ لگا دیتا ہے' تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مظاہر فطرت کا بھی گہری نظروں سے جائزہ لے۔ ان پر غور و فکر کرے تا کہ اسے اپنی ذات اور اپنے اس مقام و مرتبے کا احساس ہو جائے جو قدرت نے اسے عطا کیا ہے۔ اسے مسجودِ ملائک کے اعزاز سے نوازا گیا' احسنِ تقویم پر تخلیق کیا گیا۔ اس عمل سے اسے اپنے خالق و مصور کے عظیم ہستی ہونے' اس کی قدرت اور اس کی ربوبیت پر یقین کامل حاصل ہوگا۔ یوں رزق کی تلاش میں رازق نظروں سے اوجھل نہیں ہو پائے گا۔

ماٰخذ:

(۱) ترجمہ: فتح الحمید' مولانا فتح محمد جالندھری

(۲) درست اردو' آسی ضیائی

(۳) تحسینِ اردو' طاہر شادانی' آسی ضیائی

(۴) ہم مطالعہ کیوں نہیں کرتے؟ شاہنواز فاروقی

(۵) تعلیم و تربیت' ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

وقت ـــــ متاعِ بے بہا

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

وقت جس قدر قابلِ قدر نعمت ہے' عموماً اسی قدر اس سے غفلت برتی جاتی ہے۔ ہر نعمت کا کوئی نہ کوئی متبادل مل جاتا ہے یا اگر وہ ضائع ہو جائے تو اس کی تلافی کی جاسکتی ہے مگر وقت ایسی نعمت ہے کہ اگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے تو بس حسرت ہی باقی رہ جاتی ہے۔ وقت لوٹایا نہیں جاسکتا۔ بچپن تو لاڈ پیار میں گزر جاتا ہے۔ ماں باپ اولاد پر سختی نہیں کرتے اور ان کی ہر تمنّا پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اکثر والدین خود وقت کی اہمیت سے غافل ہوتے ہیں' وہ اپنی اولاد کو وقت کی اہمیت کا کیا سبق دیں گے۔ جوانی آجائے تو بچپن کا گزرا ہوا زمانہ واپس نہیں آسکتا۔ اسی طرح جوانی کا زمانہ من پسند گزار لیا جائے اور بڑھاپا طاری ہو جائے تو جوانی کسی قیمت اور کسی حیلے واپس نہیں آسکتی۔ بڑھاپے میں جب انسان پر کمزوری آجاتی ہے تو وہ اچھی غذائیں اور مقوی ادویات استعمال کرتا ہے مگر کمزوری ہے کہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ مختلف بیماریاں اسے آلیتی ہیں اور موت قریب ہوتے نظر آنے لگتی ہے۔ اس پر حسرت طاری ہو جاتی ہے کہ جوانی کے قیمتی ایام بے فکری اور لہو ولعب میں کیوں گزار دیے۔ مگر یہ سوچنا بے کار ہوتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے ع گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں!

ہر انسان دوسروں کو مرتا دیکھتا ہے۔ یہ مرنے والے صرف بوڑھے ہی نہیں بلکہ جوان بھی ہوتے ہیں۔ زیادہ لوگ مرنے والے کا جنازہ پڑھتے ہیں اور پھر دنیا کے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو میت کے ساتھ قبرستان تک جاتے ہیں اور مُردے کو قبر میں دفن کرتے ہیں' مگر اس منظر سے کم ہی عبرت حاصل کی جاتی ہے۔ عام مشاہدہ یہ ہے کہ جوان آدمی تو موت کو صرف بوڑھوں ہی کا حق سمجھتا ہے اور اپنی موت کو بہت دور دیکھتا ہے۔

مرنے کے بعد اگلی زندگی شروع ہو جاتی ہے اور زندہ انسانوں کے ساتھ مرنے والے کا

تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ وہ قبر کی تنہائی اور تاریکی میں اکیلا رہ جاتا ہے۔ نہ مال اُس کے کسی کام آسکتا ہے اور نہ سجن دوست اُس کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ اب جو کچھ ہونا ہے' بس اُسی کے ساتھ ہونا ہے۔ قبر ہی میں باز پُرس کا آغاز ہو جاتا ہے۔ مرتے ہی انسان پر واضح ہو جاتا ہے کہ اب کون سی چیز اُس کے کام آئے گی اور کون سی اُس کے لیے دکھ کا باعث ہوگی۔ خالقِ کائنات نے نیکی اور برائی کا شعور ہر شخص کی فطرت میں رکھ دیا ہے۔ یہ بھی بتا دیا گیا کہ نیکی کے کیا نتائج ہوں گے اور برائی کا کیا انجام ہوگا۔ جس نے دنیاوی زندگی اچھے کاموں میں گزاری ہوگی اس کی اُخروی زندگی خوش گوار ہوگی اور جس نے غفلت کا مظاہرہ کیا ہوگا وہ اذیت سے دوچار ہوگا۔ دُنیا میں تو کوئی نامناسب کام سرزد ہو جائے تو بندہ اس سے عبرت حاصل کر کے اپنا طریقہ بدل لیتا ہے اور نقصان دہ کام کو چھوڑ دیتا ہے مگر آخری سانس لیتے ہی انسان کے لیے یہ موقع ختم ہو جاتا ہے۔ اب تو اس کے بدلے میں سزا ہی برداشت کرنا ہوگی۔ مرنے کے بعد دنیا میں واپسی نہیں ہوگی' یہ حقیقت ہر انسان جانتا ہے۔ اس کے باوجود دُنیا کی زندگی کے ماہ وسال کو غفلت میں گزارنا کس قدر حماقت ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ جب آدمی مرجائے گا تو تمنّا کرے گا کہ کاش! مجھے دنیا میں واپس لوٹا دیا جائے تو اب اچھے کام کروں گا اور بُرائیوں سے بچوں گا۔

ہمارے دین میں دنیا کی حقیقت کو بار بار واضح کیا گیا ہے کہ ہر شخص کو جو مہلتِ عمر ملی ہے وہ آنے والی حقیقی اور پائیدار زندگی کے لیے تیاری کا موقع ہے۔ انسان جو بوئے گا' وہی کاٹے گا۔ اس کے اچھے کام انعام کا باعث ہوں گے جبکہ بُرے کام سزا دلائیں گے۔ ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے!

یہ بات لازم نہیں ہے کہ دنیا میں نیکی کا اچھا بدلہ اور برائی کی سزا ملے۔ ایسی مثالیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اصل بدلہ تو آخرت میں ملے گا جب اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی ہوگی۔

انسان سے پوچھا جائے گا کہ تمہیں جوانی کے جو اوقات ملے تھے وہ کیسے گزارے؟ بڑھاپا کن مشاغل میں گزارا؟ مال کیسے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ ان سوالوں کا جواب ربّ العزت کے سامنے دینا پڑے گا جہاں کوئی بہانہ کام آئے گا نہ بندہ جھوٹ بول کر جان چھڑا سکے گا۔ گویا

اپنے کیے ہوئے ہر چھوٹے بڑے عمل کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ انسان کے اچھے بُرے اعمال ریکارڈ ہو رہے ہیں۔ یومِ حساب اگر انسان چاہے گا کہ وہ غلط بیانی کر لے تو اس کے ہاتھ‘ پاؤں اور دوسرے اعضاء بول کر بتا دیں گے کہ اس نے یہ کام کیا تھا۔ جس جگہ پر بُرائی کی ہوگی وہ بھی گواہی دے گی کہ اس نے یہاں یہ گناہ کیا تھا۔ جب حساب کتاب کی یہ کیفیت ہوگی تو پھر کیسے کوئی اپنے گناہوں کے انجام سے بچ سکتا ہے!

قرآن مجید میں سورۃ الزلزال کے آخر میں ارشاد ہے کہ ’’جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرّہ برابر بُرائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا‘‘۔ گویا صرف بڑے بڑے گناہ ہی نہیں دیکھے جائیں گے بلکہ چھوٹے گناہ بھی قابل گرفت ہوں گے۔ اسی طرح کوئی نیک کام چھوٹا ہو یا بڑا‘ ثواب کا باعث بنے گا۔ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے‘ لہٰذا وہ اپنی نیکیوں پر نہ اترائے بلکہ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی بخشش کا طالب رہے۔ دوسری جانب گناہ گار اپنے گناہوں کے سبب مایوس نہ ہو‘ کیونکہ اللہ کی رحمت بے حساب ہے۔ اس امید اور خوف کے درمیان ہی سیدھا راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے سزا دے۔

یہاں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ کوئی انسان دوسرے انسان کا نقصان نہ کرے‘ اُس کا حق نہ مارے‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق تو جس کے لیے چاہے گا معاف کر دے گا‘ مگر حقوق العباد کے معاملے میں دخل نہ دے گا۔ جس نے دوسروں کی حق تلفی کی ہوگی‘ اسے حق دار کو حق ادا کرنے کا کہا جائے گا۔ اُس جہان میں حق ادا کرنے کی صورت یہ ہوگی کہ حق دار کو حق تلف کرنے والے کی نیکیاں دی جائیں گی۔ اگر نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو حق دار کے گناہ حق تلف کرنے والے کے کھاتے میں ڈالے جائیں گے۔

الغرض دنیا کی زندگی میں ملا ہوا وقت جسے عمر کہتے ہیں‘ انتہائی اہم ہے۔ اس کو ضائع کرنے والا پچھتائے گا‘ مگر یہ پچھتانا بے سود ہوگا۔ دانا وہی ہے جو اس عارضی زندگی میں اللہ کی پسند کے کام کرے اور اس کی ناراضی والے کاموں سے بچے۔ کسی کا حق نہ کھائے۔ جھوٹ‘ فریب اور رشوت کی کمائی سے باز رہے‘ کیونکہ لوگوں کا لوٹا اور کھایا ہوا مال آخرت میں کسی صورت واپس نہ کر سکے گا۔ یوں وہ آخرت کی سزا کا مستحق بن جائے گا۔ دنیا کی آگ کے مقابلہ میں دوزخ کی آگ ستّر گنا تیز ہوگی۔

ہر شخص کی عمر وقت کی ایک مقدار ہے۔ عمر کے جو لمحات گزر گئے وہ ہرگز واپس نہیں آ سکتے۔ اگر وہ غفلت میں اور بے احتیاطی میں گزر گئے تو افسوس صد افسوس! دانش مندی یہ ہے کہ جو وقت اپنے پاس ہے‘ اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے۔ گزرے ہوئے لمحات کی غلطیوں سے عبرت حاصل کر کے آئندہ کا وقت احتیاط کے ساتھ گزارا جائے۔ ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اِک اور گھٹا دی!

ہر شخص لحہ بہ لحہ موت سے قریب تر ہو رہا ہے۔ عمل کی مہلت گھٹتی جا رہی ہے۔ اس متاعِ بے بہا کو غفلت میں گزارنا انتہائی خطرناک ہے۔ اسے پسندیدہ اعمال میں بسر کرنے والا شخص ہی آئندہ زندگی میں حقیقی طور پر کامیاب اور خوش و خرم رہے گا۔

❁❁❁

بقیہ: بیان القرآن

نوٹ کیجیے‘ جس مضمون سے سورت کا آغاز ہوا تھا اختتام پر وہی مضمون دوبارہ آ گیا ہے۔ قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ سے یہودی مراد ہیں اور یہاں اہلِ ایمان کو واضح طور پر منع کیا گیا ہے کہ ان کے ساتھ تمہاری دوستی نہیں ہونی چاہیے۔

﴿قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴿۱۳﴾﴾

’’یہ لوگ آخرت سے مایوس ہو چکے ہیں جیسے کہ کُفّار مایوس ہو چکے ہیں اصحابِ قبور میں سے۔‘‘

آیت کے اس حصّے کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ یہ لوگ آخرت سے ایسے مایوس ہو چکے ہیں جیسے قبروں میں پڑے ہوئے کُفّار اپنی نجات سے مایوس ہیں۔ ظاہر ہے مرنے کے بعد کُفّار پر تمام حقائق منکشف ہو چکے ہیں اور ان حقائق کو دیکھتے ہوئے انہیں سزا سے بچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ دوسرا مفہوم یوں ہے کہ یہ لوگ آخرت سے ایسے مایوس ہو چکے ہیں جیسے کُفّار اصحاب القبور کے دوبارہ اٹھنے سے مایوس ہیں۔ یہ دونوں مفاہیم اپنی اپنی جگہ درست ہیں‘ اس لیے اس فقرے کے تراجم دونوں طرح سے کیے گئے ہیں۔

❁❁❁

تفسیر کے ناقابلِ اعتبار مآخذ (۳)

بسلسلہ علمِ تفسیر اور مفسّرین کرام (۱۰)

پروفیسر حافظ قاسم رضوان

(۴) تفسیر بالرّائے

حدیث مبارکہ میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ((مَنْ قَالَ فِی الْقُرْآنَ بِرَأْیِهٖ فَاَصَابَ فَقَدْ اَخْطَأَ)) (رواہ الترمذی) ''جو شخص قرآن کے بارے میں اپنی رائے سے کوئی گفتگو کرے، تو اگر صحیح بات بھی کہے تو اُس نے غلطی کی''۔ علّامہ ماوردی کا کہنا ہے کہ بعض غلو پسند لوگوں نے اس حدیث کا یہ مفہوم سمجھا کہ قرآن مجید کے بارے میں کوئی بھی بات فکر اور رائے کی بنیاد پر کہنا جائز نہیں، یہاں تک کہ اجتہاد کے ذریعے قرآن کریم سے ایسے معانی بھی مستنبط نہیں کیے جا سکتے جو اصولِ شرعیہ کے مطابق ہوں۔ لیکن ایسا خیال اور سوچ بالکل درست نہیں اس لیے کہ خود قرآن مجید نے تدبر اور استنباط کو جا بجا مستحسن قرار دیا ہے۔ اگر فکر و تدبر کے عمل پر بالکل پابندی لگا دی جائے تو پھر قرآن و سُنّت سے شرعی احکام و قوانین اخذ اور مستنبط کرنے کا دروازہ ہی سرے سے بند ہو جائے گا، لہٰذا مذکورہ بالا حدیث کا مطلب ہر قسم کی رائے پر پابندی لگانا بالکل نہیں ہے (الاتقان)۔

اس بات پر جمہور علماء کا اتفاق ہے کہ خود قرآنِ کریم اور سُنّتِ رسول ﷺ کے دوسرے دلائل کی روشنی میں اس حدیث کا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ قرآن مجید کے باب میں غور و فکر اور عقل و رائے کو بالکل استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس فرمانِ نبویؐ کا اصل منشا یہ ہے کہ قرآن پاک کی تفسیر کے لیے جو اصول اجماعی طور پر مسلّم اور طے شدہ ہیں، ان کو نظر انداز کر کے جو تفسیر قرآنی محض اپنی مرضی اور رائے کی بنیاد پر کی جائے گی، وہ قطعاً غلط اور ناجائز ہوگی۔ نیز اگر اس طرح سے یعنی محض اپنی رائے کی بنیاد پر کوئی شخص اتفاقاً کسی صحیح نتیجے پر پہنچ بھی جائے تو پھر بھی وہ خطا کار ہوگا، کیونکہ اس نے سیدھے راستے کو چھوڑ کر وہ غلط راستہ اختیار کیا جس سے حدیثِ نبویؐ نے منع کیا تھا۔ اب مسلّمہ اصولِ تفسیر کو نظر انداز کر کے صرف اپنی خواہش اور رائے کو سامنے رکھنے اور اختیار کرنے کی

بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) جس شخص کی حالت یہ ہو کہ وہ تفسیر قرآن کے بارے میں گفتگو کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، وہ محض اپنی خواہش اور رائے کے بل بوتے پر تفسیر کرنا شروع کر دے۔

(۲) کسی آیتِ قرآنی کی کوئی تفسیر صراحۃً حضور مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام یا صحابۂ کرامؓ یا تابعینؒ سے ثابت ہو اور اسے نظر انداز کر کے محض اپنی عقل سے کوئی معنی بیان کیے جائیں۔

(۳) جن آیات میں صحابہؓ و تابعینؒ سے کوئی واضح اور صریح تفسیر منقول نہیں، ان میں لغت اور زبان و ادب کے طے شدہ اصولوں کو پامال کرتے ہوئے اپنی طرف سے کوئی نئی تشریح بیان کرنا۔

(۴) قرآن و سُنّت سے براہِ راست احکام و قوانین مستنبط کرنے کے لیے اجتہاد کی اہلیت نہ رکھتے ہوئے بھی اس حوالے سے اجتہاد شروع کر دینا۔

(۵) قرآن مجید کی متشابہ آیات (جن کے بارے میں قرآن نے خود کہہ دیا ہے کہ ان کی حقیقی اور سو فیصد صحیح مراد سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا) کی اپنے پورے جزم و وثوق کے ساتھ کوئی الگ اور منفرد تفسیر بیان کرنا اور پھر اس پر مصر اور پختہ ہو جانا۔

(۶) قرآن کریم کی ایسی تفسیر بیان کرنا جس سے اسلام کے دوسرے اجماعی طور پر مسلّم اور تسلیم شدہ عقائد یا احکام پر زد پڑتی ہو۔

(۷) تفسیر کے معاملے میں جہاں صحیح طریقے سے عقل و فکر کا استعمال جائز ہے، وہاں کسی قطعی اور شرعی دلیل کے بغیر اپنی ذاتی رائے کو ہی یقینی طور پر درست اور مبنی بر صحیح اور دوسرے سب مجتہدین کی آراء اور اقوال کو یقینی طور سے باطل اور مبنی بر خطا قرار دینا۔

بیان کردہ یہ تمام صورتیں اسی 'تفسیر بالرّأی' کی ہیں جن سے مذکورہ بالا حدیثِ نبویؐ میں منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک دوسری حدیث میں ان تمام صورتوں کو آنحضرت ﷺ نے ایک مختصر جملے میں سمیٹ دیا ہے، فرمایا: ((مَنْ قَالَ فِی الْقُرْآنِ بِغَیْرِ عِلْمٍ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ)) (رواہ الترمذی) ''جو شخص قرآن کے معاملے میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے''۔

لفظ 'الرّأی' کا اطلاق اجتہاد اور قیاس پر کیا جاتا ہے، اسی لیے قیاس کے قائلین کو اصحابُ الرأی کہا جاتا ہے، بنابریں 'تفسیر بالرّأی' سے مراد وہ تفسیر قرآن ہے جو اجتہاد کی مدد سے کی جائے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب کوئی عربوں کے اسلوب کلام، عربی الفاظ اور ان کے وجوہ دلالت سے بخوبی آگاہ ہو، اس کے ساتھ ساتھ اشعارِ جاہلی، اسبابِ نزول، ناسخ و منسوخ، دیگر شرعی دلائل اور ان اُمور و علوم سے ہرگز نابلد نہ ہو جو کہ ایک مفسّرِ قرآن کے لیے ناگزیر ہیں۔

تفسیر بالرائے میں اہلِ علم کا اختلاف اور ان کے دلائل

قرآن کریم کی تفسیر اپنی رائے سے کرنے کے حوالے سے علمائے کرام شروع سے ہی مختلف الخیال رہے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے نظریات و افکار اکثر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مانعینِ بالرّائے (یعنی تفسیر بالرّائے سے روکنے والوں) کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ قرآن پاک کی تفسیر اپنی رائے سے کرنا گویا اللہ تعالیٰ کی جانب بغیر علم کے ایک بات کو منسوب کرنا ہے جو کہ ممنوع ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کرنے والے کو اس بات کا یقین نہیں ہوتا کہ فلاں آیت سے اللہ تعالیٰ کی مراد کیا ہے' بلکہ وہ اپنے ظن اور رائے کی بنیاد پر ایک بات کہتا ہے اور ظن کی اساس پر کچھ کہنا گویا بلا دلیل و برہان اللہ تعالیٰ پر ایک طرح کا الزام عائد کرنا ہے۔ اس کی حرمت کی دلیل سورۃ الاعراف کی یہ آیت ہے: ﴿اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾﴾ ''کیا تم اللہ کے بارے میں وہ بات کہہ رہے ہو جو تم جانتے ہی نہیں؟'' نیز سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ﴾ (آیت ۳۶) ''اور جس بات کا تمہیں علم ہی نہیں اُس کے پیچھے مت پڑو!'

مجوزین تفسیر بالرّائے (اس کو جائز قرار دینے والوں) کا جواب کچھ یوں ہے کہ ظن (گمان) اس وقت ممنوع ہوتا ہے جب قطعی اور یقینی علم تک پہنچنا ممکن ہو' بایں طور کہ اس حوالے سے شرعی نصوص میں سے کوئی قطعی نص موجود ہو یا ایسی عقلی دلیل پائی جاتی ہو جو کہ بالکل مفیدِ یقین ہو۔ مگر جہاں قطعی یقین کا کوئی امکان نہ ہو' وہاں ظن ہی کافی ہے۔ ایسی صورت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بھی ظن پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے' سورۃ البقرۃ میں فرمانِ الٰہی ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ﴾ (آیت ۲۸۶) ''اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا''۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے صحیح اجتہاد کرنے والے کو دوہرے اجر اور (خلوصِ نیت کے باوجود) اجتہاد میں خطا کر گزرنے والے کو اکہرے اجر کا مستحق ٹھہرایا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا والی بنا کر بھیجا تو رخصتی کے وقت ان سے دریافت کیا کہ لوگوں کے مسائل کا فیصلہ کیسے کرو گے؟ حضرت معاذؓ نے جواب دیا کہ میں کتاب اللہ کی روشنی میں لوگوں کے فیصلے کروں گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر کتاب اللہ میں مسئلے کا حل نہ ہو تو پھر؟ انہوں نے جواب دیا کہ سُنّتِ رسولؐ کے مطابق اس کا حل تلاش کروں گا۔ حضور ﷺ نے پھر فرمایا کہ اگر سُنّتِ رسول اللہ ﷺ میں بھی مسئلے کا حل نہ ہو تو پھر؟ حضرت معاذؓ نے عرض کیا کہ پھر مَیں کسی قسم کی

کوتاہی کیے بغیر اپنی رائے (اجتہاد) سے کام لوں گا۔ اس پر حضور ﷺ نے ان کے سینے پر اپنا دستِ مبارک مارا اور فرمایا: ''اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تُو نے اپنے رسولؐ کے قاصد سے وہ بات کہلوائی جس کو سن کر تیرا پیغمبر راضی ہو گیا۔ (ابوداؤد)

سورۃ النحل میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (آیت ۴۴) ''اور (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپؐ پر الذکر (قرآن) نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے لیے اس کی وضاحت کر دیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے''۔ اس آیت میں قرآن مجید کی وضاحت اور تشریح کرنے کو آنحضرت ﷺ کی جانب منسوب کر کے اس کو آپ کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔ مجوزین کی طرف سے اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کو واقعی توضیحِ قرآن کا حکم دیا گیا ہے' مگر آپؐ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے اور پورے قرآن کی تفسیر نہ ہو پائی' لہٰذا جو تفسیر قرآنی اب آنحضرت ﷺ سے مستند طور پر منقول ہے اس میں تو کسی دوسرے کی رائے یا قول معتبر اور مقبول ہو ہی نہیں سکتا' البتہ جس آیتِ قرآنی کی تشریح آپؐ سے ثابت نہیں' اس میں اہلِ علم اور مفسرین شرعی اصولوں کی روشنی میں رائے زنی کر سکتے ہیں۔ اس کی دلیل خود مذکورہ بالا آیت کے آخری حصے میں موجود ہے: ﴿وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾﴾ ''اور تاکہ وہ غور و فکر کریں۔''

مانعینِ تفسیر بالرّائے درج ذیل حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جس میں قرآن مجید کے حوالے سے اپنی رائے دینے سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''مجھ سے وہی بات (حدیث) روایت کرو جس کا تمہیں یقین ہو۔ جس شخص نے مجھ پر دانستہ جھوٹ باندھا اس نے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لیا۔ اور جس نے قرآن میں رائے زنی سے کام لیا' اس نے بھی اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنا لیا۔'' (سنن الترمذی)

مجوزین بالرّائے نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ اس حدیثِ نبویؐ میں ایسی رائے دینے سے منع کیا گیا ہے جو دلیل و برہان کے بغیر ہو یا پھر ایسی رائے مراد ہے جو صرف ظاہری عربی الفاظ کی بنیاد پر دی جائے اور اس میں عربوں کے مسموع لغات و اشعار کی جانب رجوع نہ کیا جائے۔ البتہ جہاں تک شرعی دلائل پر مبنی رائے کا تعلق ہے' اس میں کوئی حرج نہیں۔

تفسیر بالرّائے کو جائز قرار دینے والوں کے مطابق قرآن کریم میں بہت سی ایسی آیات ہیں جن میں غور و فکر اور تدبّر کی دعوت دی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ محمدؐ میں ارشاد ربانی ہے: ﴿اَفَلَا

يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ ’’وہ قرآن پاک میں غور وفکر کیوں نہیں کرتے‘ کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟‘‘ سورۂ صٓ میں فرمان الٰہی ہے: ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۹﴾ ’’یہ بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف اس لیے نازل فرمایا ہے کہ لوگ اس کی آیتوں پر غور وفکر کریں اور عقل مند اس سے نصیحت حاصل کریں‘‘۔ اسی طرح سورۃ النساء میں فرمایا گیا: ﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴾ (آیت ۸۲) ’’وہ قرآن میں غور وفکر کیوں نہیں کرتے؟‘‘ ان آیاتِ قرآنی میں یہ رغبت دلائی گئی ہے کہ کلام اللہ میں فکر وتدبر کر کے ان سے عبرت وموعظت اور علم و معرفت حاصل کرنی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں علمائے کرام کے لیے تفسیر اور شرعی اصولوں کے مطابق اپنی رائے کا اظہار کیونکر ممنوع ہوسکتا ہے؟ اسی طرح اگر تفسیر بالرّائے مکمل ناجائز ہوتو اجتہاد کے لیے بھی وجہِ جواز نہیں بنتی‘ حالانکہ ایسا بالکل نہیں ہے اور شرعی حدود کے مطابق اجتہاد کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوسکتا۔ حدیث کی روشنی میں مجتہد غلطی پر ہونے کی صورت میں بھی عند اللہ اجر کا مستحق ہوتا ہے۔

جب تمام آیاتِ قرآنی کی تفسیر وتشریح حضور ﷺ سے ثابت نہیں تو لامحالہ ان میں غور وفکر تو کرنا پڑے گا اور اس کا اظہار رائے کے ذریعے ہوگا۔ نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ نے بھی تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حق میں یہ دعا فرمائی تھی: ((اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيْلَ)) (متفق علیہ) ’’اے اللہ! اس کو دین کا فہم عطا کر اور قرآن کی تاویل (تفسیر) سکھا دے‘‘۔ اگر تفسیر قرآن کا مدار صرف نقل وسماع پر ہی ہوتا تو پھر حضرت ابن عباسؓ کے حق میں یہ دعا فائدہ مند ثابت نہ ہوسکتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے حضرت ابن عباسؓ کے حق میں جس تاویل کی دعا فرمائی تھی‘ وہ نقل وسماع کے علاوہ رائے اور اجتہاد پر مبنی تفسیر وتاویل ہے۔

ہر دو آراء کے اختلاف کے ضمن میں امام غزالیؒ کا کہنا ہے: ’’بنابریں تفسیر قرآن میں نقل وسماع کی شرط باطل ٹھہری‘ ہر شخص کے لیے اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنی عقلی استطاعت کی حد تک قرآن کریم سے استنباطِ مسائل کرے۔ قرآن مجید کے معانی ومطالب کے فہم وادراک کا میدان نہایت وسیع ہے۔ یہ غلط ہے کہ منقول تفسیر پر فہم وادراک کی حد ختم ہوجاتی ہے۔‘‘ (احیائے علوم الدّین)

اسی طور پر امام راغب اصفہانی اپنی تفسیر کے مقدمہ میں فریقین کے دلائل کا ذکر کرنے کے

بعد لکھتے ہیں کہ یہ دونوں (مانعین اور مجوزین تفسیر بالرائے) مذہب (مکتبۂ فکر) دراصل افراط و تفریط پر مبنی ہیں‘ جس نے (صرف) تفسیر منقول (ماثور) پر انحصار کیا‘ اس نے تفسیر کے نہایت ضروری حصے کو نظر انداز کر دیا اور جس نے ہر کس وناکس کو تفسیر قرآن کی اجازت دی اس نے کتابِ عزیز کو اختلاط وامتزاج کا نشانہ بنا دیا‘ گویا اس نے قرآن کریم کی آیت ﴿لِيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ﴾ کا صحیح مفہوم ہی نہیں سمجھا۔ آخر میں اس بحث کو علّامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے ان الفاظ پر ختم کیا جاتا ہے:

’’یہ منشا ہرگز نہیں کہ فکر واستدلال ایک محض عبث اور لغو چیز ہے‘ یا اس سے تعرض کرنا کوئی شرعی گناہ ہے‘ لیکن ہاں! کسی فرد بشر کے واسطے ہم یہ جائز نہیں رکھتے کہ وہ اپنی عقلِ شخصی اور فکرِ ناقص کو اصلِ اصول ٹھہرا کر انبیاء علیہم السلام کے پاک وصاف‘ صحیح وصادق اور بلند وبرتر تعلیمات کو زبردستی ان پر منطبق کرنے کی کوشش کرے‘ جس پر اکثر اوقات اس کا ضمیر بھی اندر سے نفریں کر رہا ہو۔ اس کے برخلاف نہایت ضروری ہے کہ انسان خدا اور اس کے رسولوں کے ارشادات کو اصل قرار دے کر اپنی عقلی معلومات کو ان کے تابع بنا دے‘ اور جو کچھ وہ فرمائیں اس کو اپنے امراضِ روحانی کے حق میں اکسیر شفا تصور کر کے سمعًا وطاعةً (سنا اور مانا) کہتا ہوا بلا حُجّت واقرار سر آنکھوں پر رکھے۔ (سورۃ الشوریٰ میں فرمان الٰہی ہے:) ﴿وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۶﴾ ’’اور جو لوگ اللہ کے بارے میں (نبی اکرم ﷺ سے) جھگڑا کرتے ہیں‘ جبکہ مخلوق اس کی بات قبول کر چکی‘ تو ان کی حُجّت باطل ہے ان کے ربّ کے یہاں اور ان پر (اللہ تعالیٰ کا) غضب ہے اور ان کے لیے سخت عذاب ہے۔‘‘ (ماخوذ از: العقل والنقل)

تفسیر بالروایت (ماثور) اور تفسیر بالرائے کے اختلاف کی حقیقت

اس ذیل میں تفسیر بالرّائے کے مانعین نے جس تشدد سے کام لیا ہے‘ اگر اس کے اسباب ووجوہ پر غور کیا جائے اور ساتھ ہی دیکھا جائے کہ جن اصحاب نے تفسیر بالرّائے کی اجازت دی ہے‘ انہوں نے اس ضمن میں کون سی شرائط عائد کی ہیں جن کا پایا جانا لازمی ہے‘ اس کے پہلو بہ پہلو دقت نظر کے ساتھ فریقین کے براہین ودلائل کا تجزیہ کیا جائے‘ تو پھر یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ یہ باہمی اختلاف ونزاع صرف لفظی ہے‘ حقیقی نہیں۔ اس کی وضاحت درج ذیل ہے۔ آپ سمجھیں کہ رائے کی دو اقسام ہیں:

(ا) ایک تو وہ رائے ہے جو کلامِ عرب کے موافق اور کتاب وسُنّت کے ہم آہنگ ہو‘ نیز اس میں

تفسیر قرآنی کی تمام ضروری شرائط اور قواعد کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔ اس قسم کی رائے بلاشبہ جائز اور درست ہے اور جن علمائے کرام نے تفسیر بالرّائے کی اجازت دی ہے‘ ان کی مراد بالکل اسی قسم کی رائے ہے۔

(ب) دوسری قسم کی رائے وہ ہے جو قوانینِ عربیت کے خلاف ہو اور شرعی دلائل سے میل نہ کھاتی ہو یا اس کے الٹ ہو‘ نیز اس میں فنِ تفسیر کی ضروری شرائط اور ضوابط کا بھی فقدان ہو‘ تو اس قسم کی رائے کا ملاً ممنوع و مذموم ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیان کیا کہ تم کتاب اللہ کی طرف دعوت دینے والے ایسے لوگوں کو پاؤ گے جو بذاتِ خود کلامِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال چکے ہیں‘ ایسے حالات میں تم علم و دلیل کے دامن کو تھامے رکھنا اور بدعات و تکلف سے احتراز کرنا۔ اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ارشادِ گرامی ہے کہ مجھے دو آدمیوں سے ڈر لگتا ہے‘ ایک وہ شخص جو قرآن کی غلط تاویل کرتا ہے اور دوسرا وہ جو بادشاہ (حکمران) کو اپنے بھائی کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ اس قسم کے تمام اقوال ایسی تفسیر کے بارے میں ہی منقول ہیں جن میں قوانینِ لغت اور شرعی دلائل کو اپنے مسلک اور ذاتی رائے کے تابع بنا دیا گیا ہو۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ مانعین تفسیر بالرّائے کے اقوال نقل کرنے کے بعد اپنا فیصلہ سناتے ہیں:

’’ائمہ سلف سے اس ضمن میں جو اقوال بھی منقول ہیں‘ وہ اسی قسم کی تفسیر سے متعلق ہیں جو بلاعلم و برہان ہو‘ جہاں تک لغت و شرع پر مبنی تفسیر کا تعلق ہے اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء سے بکثرت تفسیری اقوال منقول ہیں اور ان کے یہ اقوال علم و تحقیق پر مبنی ہیں۔ جو بات انہیں معلوم نہ ہوتی اس کے بارے میں خاموشی اختیار کرتے۔ یہی بات اہلِ علم پر واجب بھی ہے کہ جو بات معلوم نہ ہو اس کے بارے میں سکوت سے کام لیا جائے اور جو معلوم ہو اس کا برملا اظہار کر دیا جائے اور اسے چھپایا نہ جائے۔ قرآن کریم کی سورۂ آلِ عمران میں فرمایا گیا: ﴿لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ﴾ (آیت ۱۸۷) ’’اسے لوگوں کے سامنے بیان کریں گے اور اسے چھپائیں گے نہیں‘‘۔ نیز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس سے کوئی علمی بات پوچھی گئی اور اس نے اسے چھپایا تو روزِ قیامت اس کے منہ میں آگ کی لگام دی جائے گی۔‘‘ (مقدمہ اصولِ تفسیر‘ از ابن تیمیہ)

اس بیان سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ تفسیر بالرّائے کی دو اقسام ہیں:

(ا) ایک قسم ممنوع‘ مذموم اور ناروا ہے۔

(ب) دوسری قسم غیر مذموم‘ جائز اور درست ہے‘ اس کے ساتھ کچھ حدود و قیود ہیں‘ اس کے بغیر صحیح نہیں۔

تفسیر ماثور اور تفسیر بالرّائے میں تعارض

تفسیر بالرّائے کی دو اقسام میں سے پہلی مذموم اور ناقابلِ قبول ہے‘ جبکہ دوسری ممدوح و قابلِ قبول ہے۔ پہلی قسم اور تفسیر بالرّائے میں کسی تعارض کا امکان ہی نہیں‘ کیونکہ تفسیر بالرّائے کی یہ قسم تفسیر کے صحیح مفہوم سے ہی خارج ہے اور اس کو تفسیر کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ رہی دوسری قسم تو اس کے اور تفسیر ماثور کے درمیان تعارض پایا تو جا سکتا ہے‘ مگر یہ امر پیشِ نظر رہے کہ اس تعارض کا یہ مطلب نہیں کہ یہ ایک دوسرے کے مدِمقابل ہوتے ہیں‘ ایک دوسرے کی نفی ہی کرتے ہیں اور کسی حالت میں ان کا اجتماع ممکن نہیں۔ بلکہ جب دونوں میں مغائرت پائی جاتی ہو مگر منافات نہ ہو اور دونوں کا جمع کرنا ممکن ہو تو پھر اس کو تعارض نہیں کہتے۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ قرآن کے الفاظ اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی تفسیر خود قرآنِ کریم‘ اسلام‘ طریقِ عبودیت اور اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے کی جاتی ہے۔ یہ سب معانی اگرچہ باہم الگ الگ ہیں مگر ایک دوسرے کے منافی اور معارض نہیں۔ اس لیے کہ دینِ اسلام کا جو طریق ہے وہی قرآن کا بھی ہے۔ طریقِ عبودیت اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا طریقہ بھی یہی ہے‘ لہٰذا اس ساری تفسیر میں کوئی تخالف و تعارض نہیں پایا جاتا۔

تفسیر بالرّائے (عقلی) اور تفسیر ماثور (منقول) میں جو تعارض پایا جا سکتا ہے‘ اس کی عقلاً تین صورتیں ممکن ہیں: (ا) تفسیر عقلی و نقلی دونوں قطعی ہوں۔ (ب) ایک قطعی اور دوسری ظنی ہو۔ (ج) دونوں تفسیریں ظنی ہوں۔ ان تین میں سے پہلی صورت فرضی ہے اور اس کا پایا جانا ممکن نہیں۔ قطعیات میں سرے سے تعارض کا کوئی امکان ہی نہیں ہوتا۔ دوسری صورت میں قطعی جو ہے وہ ظنی سے مقدّم ہوگی‘ اس لیے کہ قطعی تو ظنی کے مقابلے میں ارجح و اقویٰ ہوتی ہے۔ جہاں تک تیسری صورت کا تعلق ہے تو اگر تفسیر عقلی و نقلی میں جمع و تطبیق ممکن ہو تو قرآنی الفاظ کو اس پر محمول کیا جائے گا‘ اور اگر صحیح تطبیق کا کوئی امکان پیدا نہ ہو رہا ہو تو پھر تفسیر منقول کو ترجیح دی جائے گی بشرطیکہ وہ صحیح روایت سے ثابت ہو۔ اسی طرح صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مستند تفسیری اقوال کو بھی ترجیح دی جائے گی‘ اس لیے کہ یہ عین امکان ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ ہوں۔ مزید برآں کہ اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ‘ کلام اللہ کا صحیح فہم و ادراک

رکھنے والے نزولِ قرآن کے چشم دید گواہ اور اعمالِ صالحہ کی دولت سے مالا مال تھے۔ باقی رہے اقوالِ تابعین، تو اس میں درج ذیل تفصیل پیش نظر رکھی جائے:

(۱) اگر تابعی اہلِ کتاب سے نقل و روایت اور اسرائیلیات میں معروف ہو تو صحیح عقلی تفسیر کو ترجیح دی جائے گی۔

(۲) اگر وہ اہلِ کتاب سے استفادے میں مشہور نہیں اور اس کی روایت عقلی تفسیر سے متصادم ہو، تو اس صورت میں وجہِ ترجیح کو دیکھنا پڑے گا اور پھر اسی قول کو اختیار کیا جائے جو اقرب الی الشریعہ ہو۔

(۳) اگر عقلی اور نقلی تفسیر میں سے کسی ایک کی تائید مسموع دلیل یا استدلال سے ہوتی ہو تو اس کو ترجیح دی جائے گی۔

(۴) تفسیری اقوال کے ضمن میں اگر دلائل و شواہد باہم متعارض ہوں اور ان میں تطبیق کی کوئی صورت نہ بنتی ہو، تو پھر ہم مرادِ ربّانی پر ایمان لائیں گے، مگر اس کے تعین سے اجتناب برتیں گے۔ گویا اس کی حیثیت اس مجمل اور متشابہ حکم کی سی ہوگی جس کی ابھی تفصیل اور توضیح نہ ہو پائی ہو۔

تفسیر بالرّائے کرنے والے کو کن اصول و قواعد کو مدِّنظر رکھنا چاہیے

ایسے مفسّر پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی تفسیر میں درج ذیل اصول و قواعد کو مدِّنظر رکھے اور کسی صورت بھی ان سے روگردانی نہ کرے:

(۱) مفسّر کی تفسیر اور قرآن پاک کا وہ حصّہ جس کی تفسیر کی جا رہی ہے، ان دونوں میں پوری یگانگت و موافقت ہونی چاہیے۔ یہ تفسیر ایسی نہ ہو کہ موقع محل سے بے ربط نظر آئے اور نہ ہی ایسی کہ قرآن مجید کا اصل معنی و مفہوم آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔

(۲) تفسیر میں حقیقی و مجازی دونوں معنوں کو ملحوظ رکھا جائے۔ بعض اوقات کسی کلام کے مجازی معنی مراد ہوتے ہیں اور حقیقی مفہوم مراد لینا درست نہیں ہوتا۔

(۳) آیات اور کلام کی اصل غرض و غایت ہمیشہ مدِّنظر رہنی چاہیے۔

(۴) قرآنی آیات کا باہمی توافق و تطابق پیش نظر رہنا لازمی ہے۔ ایک آیت کے آخری حصے کا جو ربط و تعلق دوسری آیت کے ابتدائی کلمات کے ساتھ ہو، اس کو پورے طور پر واضح کیا جائے تاکہ قاری کو یہ تاثر حاصل ہو کہ قرآن کریم ایک مربوط و متصل کتاب ہے اور اس کے اجزاء منتشر نہیں، باہم ملے جلے ہیں۔

(۵) ایک مفسر کے لیے اسبابِ نزول کو پیش نظر رکھنا بھی لازم ہے۔ کسی آیت کی تفسیر کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے سابقہ آیت کے ساتھ اس کا ربط و تعلق واضح کیا جائے، پھر اس کا سبب نزول بیان کیا جائے اور اس کے بعد اس کی متعلقہ تفسیر کی جائے۔ امام زرکشی ''البرہان'' کے شروع میں رقم طراز ہیں کہ مفسّرین کی عادت یہ ہے کہ وہ کسی آیت کی تفسیر کرنے سے قبل اس کا سبب نزولِ بیان کرتے ہیں۔ مفسّرین کے ہاں یہ امر متنازع فیہ ہے کہ آیا پہلے سبب نزول کا ذکر کیا جائے یا سابقہ آیت کے ساتھ مناسبت اور تعلق کا؟ اس ضمن میں تحقیق یہ ہے کہ بعض جگہ سبب نزول کا ذکر پہلے کرنا مناسب ہے اور بعض مقامات پر ربط و تعلق کا۔

(۶) ربط و تعلق اور سبب نزول بیان کرنے کے بعد مفرد الفاظ کی تحقیق کا آغاز کیا جانا چاہیے کہ علمِ لغت، صرف اور اشتقاق کے پیش نظر اس کی کیا حیثیت ہے۔ بعد ازاں ترکیبِ نحوی کی طرف توجہ دی جائے، پھر علم معانی، بیان اور بدیع کے اصول و قواعد کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اسے جانچا جائے۔ پھر یہ بتایا جائے کہ اس کلام سے مقصودِ ربانی کیا ہے۔ آخر میں متعلقہ آیت سے جو شرعی مسئلہ نکالا جا سکتا ہے وہ واضح طور پر بتایا جائے۔

(۷) غیر ضروری مسائل سے بھی احتراز کیا جانا چاہیے، مثلاً تفسیر کرتے وقت نحوی مسائل کے علل و اسباب نیز فقہ، اصولِ فقہ اور دینی عقائد کے دلائل و براہین کو زیر بحث نہ لایا جائے۔ یہ مسائل و دلائل متعلقہ علوم میں اپنی اپنی جگہ مذکور ہیں۔ لہٰذا علم تفسیر میں ان مسائل کو جوں کا توں لیا جائے، ان کے بارے میں استدلال نہ کیا جائے۔

(۸) ضعیف روایات پر مبنی اسبابِ نزول، فضائل پر مشتمل احادیثِ ضعیفہ، اسرائیلیات اور بغیر صحیح سند کے مَن گھڑت واقعات کو بالکل بیان نہ کیا جائے۔ اس سے قرآن کا حسن و جمال اور اثر انگیزی قطعاً قائم نہیں رہتی اور پڑھنے والے لوگ فکر و تدبّر اور عبرت آموزی کی بجائے کسی شک و شبہ اور گمراہی کے راستے کی طرف جا نکلتے ہیں۔

(۹) ایک مفسّر کے لیے ذہین و فطین اور بیدار مغز ہونا ضروری ہے۔ نیز اس کو قانونِ ترجیح سے بھی آگاہ ہونا چاہیے، تاکہ جب آیت میں مختلف وجوہ کا احتمال ہو تو وہ ایک قوی وجہ کو ترجیح دے سکے۔ اس سے واضح ہوا کہ قانونِ ترجیح کا ذکر و بیان بھی لازم ہے، اس لیے کہ احتمالاتِ کثیرہ کی موجودگی میں اس قانون کی اساس پر کسی ایک وجہ کو ترجیح دی جا سکتی ہے (الاتقان)۔

تفسیر بالرّائے میں غلطی کی وجوہ

جولوگ سُنّت اور مسلکِ صحابہ وتابعین سے ہٹ کر‘ لازمی اصول وقواعد اور بنیادی علوم سے بے نیاز ہوکر قرآن مجید کی تفسیر بالرّائے کرنا چاہتے ہیں‘ ان سے اکثر بڑی غلطیاں صادر ہوتی ہیں اور وہ راہِ ہدایت سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ تفسیر بالرائے میں زیادہ تر جن غلطیوں اور کوتاہیوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے‘ اس کے دو اسباب ہیں اور یہ دونوں اسباب عصرِ صحابہ وتابعین کے بعد کی پیداوار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن تفاسیر میں صرف صحابہ وتابعین کے تفسیری اقوال درج ہیں‘ مثلاً عبدالرزاق‘ عبد بن حمید اور اس دور کے دیگر علماء کی تفاسیر وغیرہ‘ وہ کتب ان دونوں قسم کی غلطیوں سے بالکل پاک ہیں۔ بخلاف ازیں جو کتب بعد میں منصۂ شہود پر آئیں جیسے شیعہ‘ معتزلہ‘ خوارج وغیرہ کی تفاسیر‘ وہ ناقابلِ معافی غلطیوں اور بسا اوقات گمراہیوں کا پلندہ ہیں۔ ان سے یہ گمراہ کن کوتاہیاں دیدہ دانستہ اپنے مسلک کی حمایت اور اپنے عقائد کے نام نہاد دفاع کے سلسلے میں صادر ہوئیں۔ بہرحال تفسیر بالرّائے میں غلطی دو وجہ سے پیدا ہوتی ہے: اوّل‘ مفسر کا ایک خاص مسلک اور عقیدہ ہوتا ہے اور وہ قرآن کے الفاظ اور مفہوم کو اس کے تابع بنانا چاہتا ہے۔ دوم‘ قرآن کریم کے الفاظ کا صرف لغوی اور ظاہری مطلب مراد لیا جائے اور یہ نہ دیکھا جائے کہ متعلقہ کلام کے نازل کرنے کا اصل مقصد کیا ہے؟ پہلی وجہ میں جو چیز پیشِ نظر ہے وہ مفسر کا اپنا عقیدہ ونظریہ ہے‘ قطع نظر اس کے کہ قرآنی الفاظ کا معنی ومطلب کچھ بھی ہو۔ اس کے برعکس دوسری وجہ میں صرف لفظ کا وہ ظاہری مفہوم مراد لیا جاتا ہے جو ایک عربی الاصل شخص اس سے سمجھ سکتا ہے‘ متکلم‘ مخاطب اور سیاقِ کلام کی طرف مطلق توجہ نہیں دی جاتی۔

وجہ اوّل سے جو غلطی رونما ہوتی ہے‘ وہ چار اقسام کی ہے:

(ا) اس کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ مفسر کسی آیت سے جو مفہوم مراد لے رہا ہے‘ وہ بجائے خود درست تو ہوتا ہے مگر مرادِ ربانی اس سے مختلف ہوتی ہے‘ صوفیہ اور واعظین حضرات کی تفاسیر عموماً اسی قسم کی ہیں۔ وہ قرآنی الفاظ کے جو معنی بیان کرتے ہیں وہ بذاتِ خود صحیح ہوتے ہیں‘ مگر ان کا بیان کردہ مفہوم اس آیت سے مراد نہیں ہوتا‘ جیسے سورۃ النساء میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ....﴾

(آیت ۶۶) ’’اور اگر ہم ان پر فرض کر دیتے کہ اپنی جانوں کو قتل کرو یا اپنے گھروں سے

نکل جاؤ....‘‘ اس کی تفسیر میں ابوعبدالرحمان السلمی کہتے ہیں کہ قتلِ نفس سے اپنی خواہشات کی مخالفت مراد ہے اور گھر سے نکل جانے کا مطلب اپنے دل سے حُبِّ دنیا کا باہر نکالنا ہے۔

(ب) اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ مفسر کسی لفظ کا جو مفہوم بیان کرتا ہے‘ وہ مطلب وہاں مراد نہیں ہوتا بلکہ تفسیر کرنے والا اس لفظ کو مقصود ومرادِ معنی سے محروم کر کے اپنا خود ساختہ مطلب پہنانے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض مسالک اور فرقوں کی تفاسیر اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ لوگ اپنے نقطۂ نظر سے الفاظ کے مخصوص یا باطنی معنی نکالتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ان الفاظ کے ظاہری معنیٰ مراد نہیں۔ جیسے سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا: ﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۵﴾ ’’اور تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جاؤ ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے‘‘۔ حسن عسکری اس کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ اس آیت میں درخت سے (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آلِ محمد کے علم کا درخت مقصود ہے۔ اہلِ بیت کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی علم سے نوازا‘ وہ علم کسی اور کو نہیں دیا۔ علم کا درخت اہلِ بیت کا خاصہ ہے اور دوسرا کوئی شخص اس سے مستفیض نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح سہل التستری اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ اس میں درخت کا پھل کھانے سے نہیں روکا گیا۔

(ج) اس غلطی کی تیسری صورت یہ ہے کہ مفسر کا بیان کردہ مفہوم غلط ہوتا ہے مگر اس کے باوجود وہ قرآن پاک سے اسی کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے‘ حالانکہ قرآنی الفاظ نہ اس مفہوم پر دلالت کرتے ہیں اور نہ ہی وہ مطلب مراد ہوتا ہے۔ اس کی مثال بعض صوفیہ کے بیان کردہ باطل معانی ہیں‘ جیسے وہ تفسیر جو ابن عربی کی جانب منسوب ہے‘ اسی قبیل سے ہے۔ سورۃ المزمل میں فرمانِ خداوندی ہے: ﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝۸ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ ’’اور اپنے رب کا نام یاد کر اور سب سے کٹ کر اسی کا ہو جا‘ جو ربّ ہے مشرق اور مغرب کا‘‘۔ ابن عربی نے اس کی تفسیر یوں کی ہے: ’’اپنے رب کا نام یاد کر اور وہ (اے انسان) تو خود ہی ہے‘ یعنی اپنے آپ کو پہچان اور اسے یاد رکھ‘ فراموش نہ کر‘ ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تجھے فراموش کر دے گا۔ نفس کی حقیقت معلوم کر کے اس کو کمال تک پہنچانے کی کوشش کر۔ تجھ پر اسی کا پَرتو پڑا ہے اور وہ تیرے وجود کے اُفق سے طلوع ہوا ہے‘ وہ تیرے وجود میں چھپ گیا ہے اور اس کا نور تجھ میں آ کر غروب ہو گیا ہے۔‘‘ اسی طرح سورۃ النساء میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾

(آیت ۸۰) ''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اُس نے گویا اللہ کی اطاعت کی''۔ ابن عربی اس کی تفسیر میں رقم طراز ہیں: ''اس لیے کہ رسولؐ جو کچھ بھی کہتا ہے اللہ کی طرف سے کہتا ہے اور اللہ کے ساتھ کہتا ہے' بلکہ رسول کے منہ سے اللہ ہی بولتا ہے' رسول صرف اس کی ظاہری تفسیر ہے' درحقیقت وہ خود ہی سب کچھ ہے۔'' (الفتوحات)

(د) اس کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ مفسر ایک لفظ یا کلام سے جو مفہوم اخذ کرتا ہے' اس میں اس کے پیش نظر قرآنی الفاظ کو ان کے اصل اور مقصود ظاہری معنی سے ہٹا کر اپنے خودساختہ اور مَن گھڑت معانی پہنانا ہوتا ہے۔ اہلِ بدعت اور باطل فرقوں کی تفاسیر اس کی روشن مثالیں ہیں' مثلاً بعض غالی گمراہ شیعہ نے تفسیر کرتے ہوئے قرآن مجید کے الفاظ ''بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ'' سے مراد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما لیے ہیں (نعوذ باللہ من ذلک!)۔ ایسے لوگ بعض دفعہ کسی لفظ کے ظاہری اور متبادر مفہوم کو نظرانداز کر کے ایک ایسا معنٰی مراد لیتے ہیں جس میں غلط قسم کا تکلّف ہوتا ہے۔ ایسا وہ اُس وقت کرتے ہیں جب انہیں محسوس ہوتا ہے کہ قرآنی الفاظ اور مفہوم ان کے باطل نظریات سے ٹکراتا ہے' جیسے سورۃ القیامہ میں فرمایا گیا: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝۲۲ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝۲۳﴾ ''کچھ چہرے اس روز تر و تازہ ہوں گے' اپنے ربّ کی طرف دیکھ رہے ہوں گے''۔ اس کے ضمن میں بعض معتزلہ کا کہنا ہے کہ لفظ 'اِلٰی' اس آیت میں 'الآلاء' کا واحد ہے اور اس کا مطلب نعمت کا ہے۔ بنابریں اس آیت کا معنی یہ ہوا کہ وہ چہرے اپنے رب کی نعمتوں کو دیکھ رہے ہوں گے۔ معتزلہ کو یہ ناپسندیدہ تکلّف اس لیے کرنا پڑا کہ آیت سے رؤیتِ باری تعالیٰ کا اثبات ہوتا ہے اور وہ اس کے منکر ہیں۔
(الامالی از سید مرتضٰی)

اب باطنیہ کی بزعم خود تفسیر کے چند نمونے ملاحظہ کریں: 'وضو' سے امام کی پیروی مراد ہے، 'صلوٰۃ' سے رسول و نبی مراد ہے، 'کعبہ' سے مراد حضورِ اَقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے، 'جنت' تکلیف سے آرام پانے کا نام ہے، 'جہنّم' مشقت اٹھانے کو کہتے ہیں، 'ملائکہ' سے باطنی فرقے کے وہ داعی مراد ہیں جو ان کے عقائد کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں، 'شیاطین' سے مراد باطنی فرقے کے مخالف لوگ ہیں' وغیرہ۔ (جاری ہے)

❁❁❁

March 2022
Vol.71

Regd. CPL No.115
No.3

Monthly **Meesaq** Lahore

قرآن حکیم کی عظمت، تعارف اور حقوق و مطالبات
جیسے علمی و عملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآن حکیم اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ تقریباً 500 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

خود پڑھیے۔
دوسروں کو تحفہ میں دیجیے!

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 600 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 350 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-042-35869501
maktaba@tanzeem.org